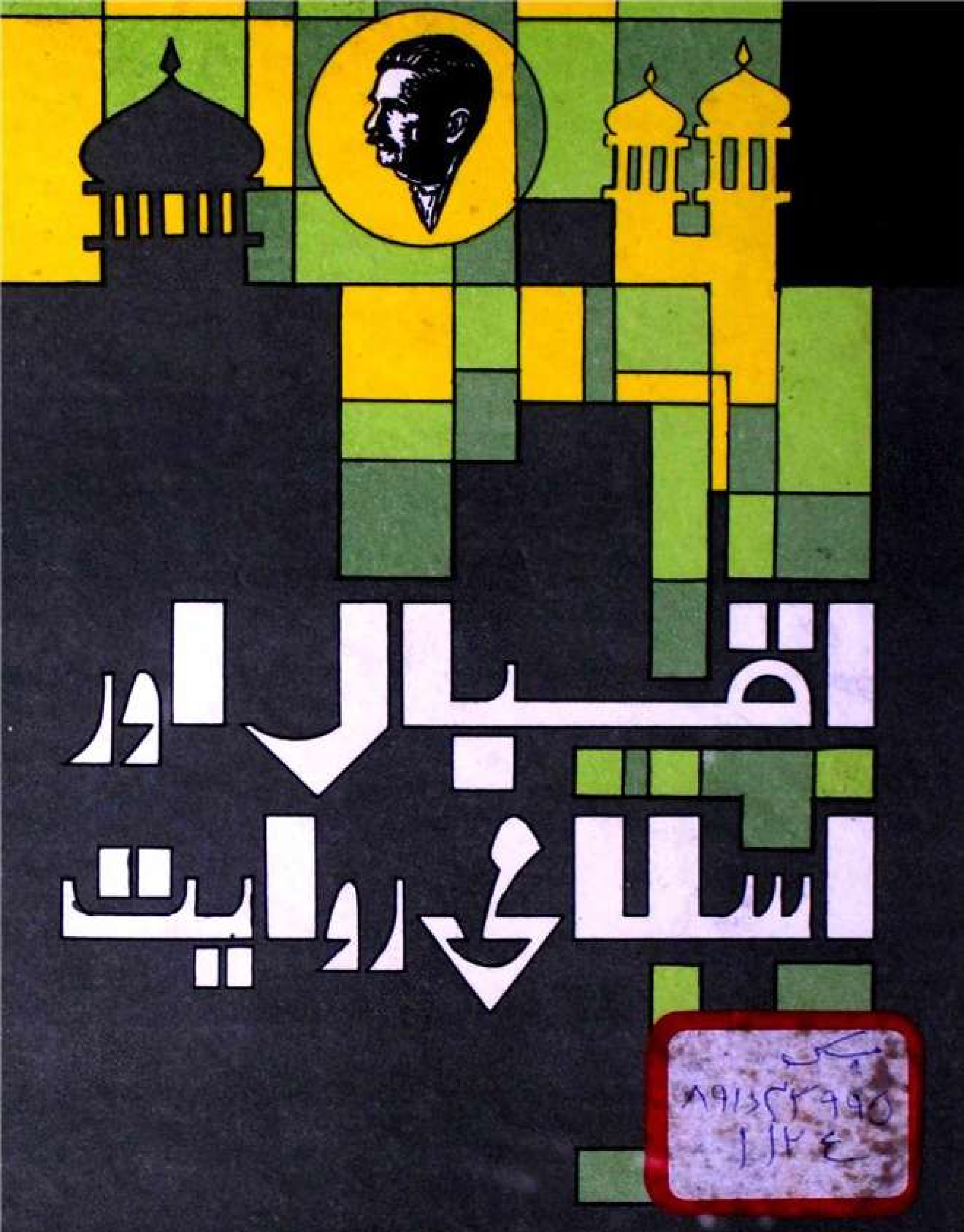

اقبال اور اسلامی روایت

بیک
٨٩١٫٤٣٩٩٥
١١٢٤

عبدالعزیز کمال

اقبال اور اسلامی روایت

عبدالعزیز کمال

بزم اقبال لاہور

اقبال اور اسلامی روایت

جملہ حقوق محفوظ

سن اشاعت مارچ ۱۹۹۵ء

ناشر: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار
اعزازی سیکرٹری
بزم اقبال ۲ کلب روڈ لاہور

مطبع: اظہر سنز پرنٹرز لٹن روڈ لاہور

تعداد اشاعت: ۵۰۰

صفحات: ۱۶۸

قیمت ۸۰ روپے

۸۹۱۵۴۳۹۹۵
۱۱۲۴

ACCESSION
13332

فہرست مضامین

۱۔ اسرار خودی کی اشاعت کے بعد	۹
۲۔ اقبال اور گرامی	۲۷
۳۔ الحمراء کی سرزمین سائنسی علوم کا گہوارہ	۴۵
۴۔ مکاتیب اقبال میں بعض اہم کتابوں کا ذکر	۷۳
۵۔ اقبال اور لسان العصر اکبر	۱۰۱
۶۔ اقبال اور پرندے	۱۳۷
۷۔ اقبال اور سید سلیمان ندوی	۱۵۷

نخل اسلام نمونہ ہے برو مندی کا
پھل ہے یہ سیکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا

کلیات اقبال اردو ، ص ۲۰۵

"اسرار خودی" کی اشاعت کے بعد

مثنوی "اسرار خودی" پہلی مرتبہ ۱۹۱۵ء میں لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ مولانا عبد المجید سالک "انجمن حمایت اسلام" کے ایک جلسے کا ذکر کرتے ہیں جو ۱۹۱۳ء میں یا اس کے قریب لاہور میں منعقد ہوا تھا۔ اور جس میں علامہ اقبال نے ابتدائی تعارف کے بعد "اسرار خودی" کے بعض مقامات پڑھ کر سنائے تھے۔ ابتدائی کلمات میں یہ اظہار بھی تھا۔

"میں نے اسرار خودی کے نام سے ایک مثنوی مرتب کی ہے جس میں خودی کے نام سے حقائق بیان کئے ہیں۔ یہ مثنوی عنقریب شائع ہو گی۔ اور اس سے عجمی تصوف کا وہ طلسم جس نے مسلمانوں کو توفیق عمل سے محروم اور جامد و منجمد کر رکھا ہے پاش پاش ہو جائے گا"۔

عجمی تصوف کے متعلق علامہ اس لیے پہلے بھی اپنی تحقیقی رائے کا اظہار اپنی کتاب فلسفہ عجم (۱) میں درج کر چکے تھے۔ گو اس کی تصنیف کے بعد ان کے خیالات بہت سے امور کے متعلق بدلتے رہے تھے۔ لیکن اس بارے میں وہ اپنے پہلے خیالات پر اسی طرح قائم رہے۔ بلکہ اسرار میں جس زور و شور کے ساتھ انہوں نے عجمی ذہن پر یونانی فلسفے کے اثرات کو بے نقاب کیا ہے۔ اس کا اظہار ۱۹۱۲ء سے پہلے بہت کم ہوا تھا۔ مثلاً خواجہ حافظ کے متعلق مثنوی میں جو رائے بیان ہوئی ہے اس کا مقابلہ اگر قیام مغرب کے دوران کی ایک لندنی محفل میں خواجہ پر علامہ کے اظہار رائے سے کیا جائے، تو اس پانچ یا چھ برس کی مدت میں اس قلب ماہیت پر حیرت ہوتی ہے عطیہ بیگم لکھتی ہیں: (۲)

The conversation turned on to Hafiz and being interested in this great poet I was able to quote appropriate verses. I discovered that Iqbal was also a great admirer of Hafiz "When I am in the mood for Hafiz" he said, "his spirit enters into my soul, and my personality merges into the poet and I myself become Hafiz"(2).

۲۰ جون ۱۹۰۷ء کی ایک محفل کے تاثرات عطیہ بیگم یوں بیان کرتی ہیں:

"I felt that Iqbal believed more in Hafiz than in any other Persian poet as there was not an occasion he let go, but referred to the ideals and ideas of Hafiz and compared him with other philosophers" (page 17)

کہاں یہ عقیدت آمیز خیالات اور کہاں "اسرار خودی" کے زوردار اشعار

ہوشیار از حافظ صہبا گسار
جامش از زہر اجل سرمایہ دار

اور:

زندہ از صحبت حافظ گریز

بظاہر اس تضاد کی توجیہ مشکل نظر آتی ہے۔ لیکن اگر ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۲ء کے درمیانی عرصے میں علامہ کی زندگی کو پیش نظر رکھا جائے تو عقدہ کشائی ممکن ہو جاتی ہے۔ اتنا معلوم ہے کہ ۱۹۰۷ء کے ماہ جون میں یا اس کے قریب پروفیسر آرنلڈ اقبال کو ہائڈل برگ (جرمنی) جانے کی ترغیب دے رہے تھے۔ کیونکہ ان کے خیال کے مطابق ہائڈل برگ فلسفے کی تعلیم کے لئے مثالی جگہ تھی کہا کرتے تھے۔ کہ ہائڈل برگ کے ماحول کی ہر شے میں فلسفہ بسا ہوا ہے اقبال رضا مند ہو گئے اور ہائڈل برگ کے قصد سے جرمنی کا رخ کیا۔ ہائڈل برگ میں علامہ کی فلسفیانہ تحصیل کی تکمیل ہوئی۔ ان کی تشنہ روح نے بہت

جلد جملہ معقولات کو اپنے اندر جذب کر لیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے تحقیقی مقالے کی ترتیب کے سلسلے میں انہوں نے اسلامی تاریخ اور قرآنی علوم کا مطالعہ بھی شروع کر دیا۔

کیمبرج میں اقبال پروفیسر جیمز وارڈ کے زیر اثر ایک وحدت الوجودی مفکر (Pantheistic Mystic) بن چکے تھے اور اسی اثر کے تحت رومی کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ خواجہ حافظ سے ان کی عقیدت غالباً خواجہ کے جوش بیان، دلکش طرز ادا اور نادر تشبیہوں کی وجہ سے تھی۔ ان کے دیوان نے صدیوں تک اس کے پڑھنے والوں کے اخلاق و عادات پر جو اثرات مرتب کئے تھے۔ ان کی طرف اقبال کی نگاہ ابھی نہیں اٹھی تھی۔

جیسا معلوم ہے، جرمنی میں اقبال کے مقالے کا موضوع ایرانی مابعد الطبیعیات کی تدریجی ترقی تھا۔ اس میں عجمی تصوف کی تاریخ سے مدد لینا ناگزیر تھا، کیونکہ ایرانی مابعد الطبیعیات اور ایرانی تصوف کا روز اول سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور دونوں اکثر ایک دوسرے میں ایسے مدغم رہے ہیں کہ ایک کا بیان دوسرے کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ مقالے کے لئے مواد جمع کرنے میں اقبال نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ یہاں تک کہ جرمن مواد سے استفادہ کرنے کی غرض سے جرمن زبان سیکھ لی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جوں جوں عجمی تصوف کا عمیق مطالعہ انہوں نے کیا ان کی نگاہ سے پردے ہٹتے گئے اور بالآخر وہ بھانپ گئے کہ عام مسلمانوں کی بے عملی، بے حسی اور ذہنی جمود کی بڑی وجہ عجمی تصوف کی اشاعت اور لوگوں کی اس سے غیر معمولی دلبستگی ہے اسلام اور عجمی تصوف کو انہوں نے باہم متضاد قرار دیا۔ ان کے نزدیک اول الذکر سراسر عمل اور خود داری و خود شناسی کا پیغام ہے اور دوسرا جمود اور نفس کشی کا ترغیب دہندہ۔

اب علامہ اس تصوف سے نفرت کرنے لگے تھے ، اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ، مزید مطالعے اور تجربے کی بدولت ان کے اس اعتقاد میں سختی آتی گئی ۔ وہ سمجھنے لگے کہ تصوف رہبانیت کی تبلیغ کے ساتھ حدود شرعی کو توڑ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اور اسلام تصوف کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے

۱۹۰۸ء میں اقبال سفر یورپ سے واپس وطن آئے اور گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے پروفیسر ہو گئے لیکن کوئی ڈیڑھ برس کی ملازمت کے بعد کالج سے علیحدہ ہو گئے اور وکالت کو ذریعہ معاش بنا لیا ۔ اسرار خودی کے زمانہ تصنیف کے آغاز ۱۹۱۲ء ۱۹۱۳ء تک ان کی طرف منسوب غالباً کوئی ایسی تحریری یا تقریری شہادت نہیں ملتی جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ انہوں نے مثنوی کے پیش خیمہ کے طور پر عجمی تصوف اور خصوصاً خواجہ حافظ کے متعلق اظہار خیال کیا ہو ۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں جب مثنوی پہلی مرتبہ مطبوع ہو کر منظر عام پر آئی تو گویا بر عظیم ہند کے ایک گوشے سے لے کر دوسرے گوشے تک بجلی کی لہر دوڑ گئی ۔ اچھے اچھے عقیدت مند اور اداشناس بگڑ گئے ۔ خصوصاً ہم عصر صوفیہ اور گدی نشین بزرگوں کی محفلوں میں تو آگ ہی لگ گئی ۔ ہر کسی نے غم و غصہ کا اظہار کیا اور اقبال کو فلسفہ زدہ ، مغرب پرست ، سودائی ، شیطان دوست اور خدا جانے کیا کیا خطاب مل گئے ۔

" اسرار خودی " کا پہلا ایڈیشن ایک نہایت مفید اردو دیباچے کے ساتھ شائع ہوا تھا ۔ اس میں " خودی " کے لفظ کی تشریح کی گئی تھی ، اور اس کے ساتھ مغلوب قوموں کے انحطاط کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی تھی ۔ یہ دیباچہ علامہ اقبال نے خود لکھا تھا ۔

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی کے وہ اشعار جن میں

خواجہ حافظ کا ذکر ہوا ہے ، درج کئے جائیں تاکہ رد عمل کا ٹھیک جائزہ لیا جاسکے ۔

۱

ہوشیار از حافظ صہبا گسار
جامش از زہر اجل سرمایہ دار

۲

نیست غیر از بادہ در بازار او
از دو جام آشفتہ شد دستار او

۳

چوں جرس صد نالہ رسوا کشید
عیش ہم در منزل جاناں نہ دید

۴

آں فقیہ ملت مے خوارگاں
آں امام ملت بے چارگاں

۵

گوسفند است و نوا آموخت است
فتنہ و ناز و ادا آموخت است

۶

دلربائی ہائے او زہر است و بس
چشم او غارت گر شہر است و بس

۷

از بز یونان زمیں زیرک تر است

۱۴

پردہ عودش حجاب اکبر است

۸

بگذر از جامش کہ در مینائے خویش
چوں مریدان حسن دارد حشیش !

۹

محفل او در خور ابرار نیست
ساغر او قابل احرار نیست !

۴

بے نیاز از محفل حافظ گذر
الحذر از گوسفنداں الحذر

پھر ایک مقام پر عرفی اور حافظ کا موازنہ کیا ہے اور عرفی کو حافظ پر ترجیح دی ہے ۔ آخری شعر ہے :

بادہ زن با عرفی ہنگامہ خیز
زندہ از صحبت حافظ گریز

یہ غالباً پہلا موقع تھا کہ کسی نے حافظ کے خلاف اس طرح علانیہ زہر اگلا ہو ۔ عام پڑھے لکھے لوگوں میں حافظ ایک خدا رسیدہ اور مقدس مذہبی بزرگ تسلیم کئے جاتے تھے ۔ شیراز میں ان کی تربت سے اکثر لوگوں نے " ہمت خواہی " کی تھی ، ان کے دیوان سے فالیں نکالی تھیں اور اس نسبت سے ان کو " لسان الغیب " کا لقب دے رکھا تھا ۔ یہ تو عوام کی عقیدت کا حال تھا ۔ علماء بھی حافظ کو عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے ان کو عارف شیراز کے نام سے یاد کرتے تھے ۔ ان کے اشعار کی شرح میں قرآن و حدیث سے استناد کرتے تھے اور ان کے کلام کو الہامی سمجھتے تھے ۔ مثلاً آزاد مرحوم ان

کو " شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار " میں لاتے ہیں تو محض اس اندیشے سے ان کو کرسی پیش نہیں کرتے کہ دنیوی جاہ و جلال سے چھو کر خواجہ کی تقدیس اور استغنا پر حرف آئے گا ۔ ان کے دیوان کو شیشہ مینائی لکھا ہے جو " فلک مینائی کے دامن سے دامن باندھے ہے " ۔ مولانا شبلی سب کچھ کہنے کے باوجود کچھ نہیں کہہ سکے البتہ اشارہ ضرور کر گئے ہیں کہ خواجہ کی تعلیم یونانی اپی کیورس (Epicurus) کی تعلیم تھی ۔ مولانا نے خواجہ کے فلسفے پر جو چند صفحات لکھے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ وہ حقیقت حال سے آشنا تھے ۔ خواجہ حالی نے " حیات سعدی " میں حافظ پر جو اظہار خیال کیا ہے اس کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ حالی کی رائے بھی حافظ کی غزل کے ان اثرات کے متعلق جو وہ اخلاق پر ڈالتی ہے اچھی نہ تھی ۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ اورنگ زیب عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ نے دیوان حافظ کا پڑھنا ممنوع قرار دے رکھا تھا ، کیونکہ اس کے مضامین سے عوام کے گمراہ ہو جانے کا اندیشہ تھا ۔ خیر ہم ذکر کر رہے تھے کہ مثنوی کی اشاعت پر سارے ملک میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی ۔ سطور آئندہ میں انہی تاثرات کا بیان ہو گا ۔

ایک صاحب خان بہادر پیر زادہ مظفر احمد صاحب فضلی نے " اسرار خودی " کے جواب میں " راز بیخودی " لکھی ۔ پیر زادہ صاحب نے اپنی مثنوی میں ڈاکٹر صاحب کو بزو گوسفند کے جواب میں کہیں شغال اور کہیں خر بنایا ہے اور دشمن اسلام اور رہزن اسلام وغیرہ خطابات بخشے ہیں ۔ ملاحظہ فرمائیے :

خود ز ما خیلے بے وحشت سگال
جامہ زن در نیل دستاں چوں شغال
فلسفی فطرت ز دیں برگشتگاں
درس سامان جنوں سرگشتگاں !

عقل و دین و داد را دشمن ہمہ
در لباس شحنگاں رہزن ہمہ
از دم گفتار دستاں داستاں
فلسفہ در دل تصوف بر زباں
دشمن جاں آمدند اسلام را
رہزن جاں آمدند اسلام را
وائے بر ایں پختگان عقل خام
اولیا را میش و بز کردند نام
از دم مکر شغالاں الحذر
الحذر از بدسگالاں الحذر

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

از خودی پیغارہ زن اسلاف را
کردہ پامال جنوں انصاف را
بندہ دنیا بہ دنیا دیں فروش
سربسر ملت فروش آئیں فروش

آخر میں علامہ کو مست اور رند قرار دے کر معذور سمجھتے ہیں:

در گزر از بادہ خوار اے محتسب!
مست را معذور دار اے محتسب (۳)

اقبال پیرزادہ صاحب کی مثنوی کے متعلق حافظ اسلم جیراجپوری کو لکھتے ہیں:

"پیر زادہ صاحب نے میرا مطلب مطلق نہیں سمجھا، تصوف سے اگر اخلاص فی العمل مراد ہے (اور یہی مفہوم قرون اولیٰ میں اس کا لیا جاتا تھا) تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ہاں جب تصوف فلسفہ بننے کی

کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظام عالم کے حقائق اور باری تعالے کی ذات کے متعلق موشگافیاں کرکے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے (۴) "۔

" اسرار خودی " کے رد میں ایک دوسری کتاب " لسان الغیب (۵) " کے نام سے نکلی ، جس کے مصنف حکیم فیروز الدین طغرائی تھے ۔ حکیم صاحب بحث سے دور جا پڑے تھے ۔ بحث ان اثرات کے متعلق تھی جو خواجہ کے کلام سے اخلاق پر پڑتے ہیں لیکن حکیم صاحب نے خواجہ کے محامد و مدائح نقل کرکے سمجھ لیا تھا کہ کافی جواب ہو گیا ۔

حضرت اکبر الہ آبادی اقبال کے بڑے مداح تھے لیکن مثنوی کی اشاعت پر وہ بھی سخت چیں بہ جبیں ہوئے اور اپنے اکثر دوستوں اور نیاز مندوں کے نام کے خطوط میں برابر اقبال کی شکایات لکھتے رہے ۔ ان دوستوں اور نیاز مندوں میں سرعبدالقادر مرحوم اور مولانا عبد الماجد دریا بادی بھی تھے ۔اول الذکر کے نام ایک پورا خط شکایت کا طومار ہے ۔ ملاحظہ ہو :

" مجھ کو معلوم ہو چکا تھا کہ ڈاکٹر اقبال کی مثنوی انگلستان میں پسند ہوئی مجھ کو اپنا یہ شعر یاد آیا :

رقیب سرٹیفکیٹ دیں تو عشق ہو تسلیم !
یہی ہے عشق تو اب ترک عاشقی اولیٰ !

میں اقبال کی قدر اس سبب سے نہیں کرتا کہ دربار لندن میں وہ مقبول ہیں :

طالب ہوں میں تو اپنے ہی دل کی نگاہ کا
سودا نہیں ہے مجھ کو حریفوں کی واہ کا

لیکن وہ بھی کیا کریں مجبور ہیں میں تو زندگی ختم کر چکا اور ہمیشہ ادھر سے بے نیاز رہا ۔ وہ تعلیم ہی نہیں ہے میں نے تو ان دو چار لفظوں میں اپنا

مطلب ادا کر دیا ہے:

عشق کو کیوں بے خودی مقصود ہے
حسن بے حد ہے خودی محدود ہے

میرا مطلع پیش نظر رکھئے:

اور بھی دور فلک ہیں ابھی آنے والے "

(۱۲ اپریل ۱۹۲۱ء)

سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط لکھتے ہیں اور آخر میں اقبال کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔ " کچھ معلوم ہے حضرت اقبال کدھر جاتے ہیں بات یہ ہے اپنا دل اپنا کام " ۔ پھر کچھ اشعار نقل کئے ہیں جن میں سے تین یہ ہیں:

ہادن تو ہے ہوس کا دستہ ہے پالسی کا
لیکن ادھر تصور جاتا نہیں کسی کا
لکھے گا کلک حسرت مسلم کی ہسٹری میں
اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں

اور:

بگذار بحال خودم اے بزم تعلی !
عبرت زدہ را کار بہ آزردگاں نیست

(۲۸ مئی ۱۹۱۷ء)

مولوی عبد الماجد صاحب کے نام ایسے خطوط خاصی زیادہ تعداد میں ہیں مولانائے دریا بادی کو ستمبر ۱۹۱۵ء کے ایک خط میں جو اسرار خودی کی اشاعت کے بعد کا اولین خط ہے تحریر فرماتے ہیں:

" دوسری مثنوی اسرار خودی مصنفہ ڈاکٹر اقبال صاحب جس میں مصنف

نے لکھا ہے کہ اپنی خودی کو مٹانے والا فلسفہ جس کا مشرق پر بہت اثر ہوا صحیح نہیں ہے ۔ خودی کو بڑھانا چاہیے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مثنوی کے متعلق تو کچھ زیادہ نہ کہنا چاہیے کیونکہ وہ مذہبی اور قومی جوش پر مبنی ہے " ۔

افسوس ہوتا ہے کہ حضرت اکبر ایسے باریک بیں شاعر بھی مشتعل ماحول کے زیر اثر " اسرار خودی " کو ایک وقتی اور ہنگامی جوش کا مظاہرہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے تھے ۔ چونکہ صوفی منش تھے اس لئے آسانی سے غلط فہمی کا شکار ہو گئے ۔ مولوی عبد الماجد صاحب کے نام کے بعض دوسرے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب اکبر کو ہر لحظہ اس بات کا غم کھائے جاتا تھا کہ اقبال تصوف کے پیچھے کیوں پڑے ہیں ۔ اگست ۱۹۱۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

" حضرت اقبال معلوم نہیں کیوں تصوف کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں " نیوایرا " میں ان کا ایک مضمون چھپا ہے ۔ میں نارمل صوفی کبھی نہیں ہوا ۔ نہ قوت نہ ضرورت لیکن اوری انٹل فلاسوفی تو عالمگیر مذاق ہے ۔ اسلامیہ تصوف خود کہتا ہے کہ شریعت کے خلاف کچھ نہ ہو ۔ خیر دنیا کے رنگ ہیں " ۔

اسی مہینے ایک اور خط لکھتے ہیں جس میں نیوایرا کے ایک اور مضمون " تصوف از اقبال " کے حوالے سے رقمطراز ہیں :

" اقبال صاحب نے عجیب تنگ اور بے سود راہ اختیار کی ہے ۔ دیدنی ہے جہان رنگا رنگ "

(خطوط مشاہیر حصہ اول ص ۱۲۶)

کسی صاحب مرزا واجد حسین صاحب یاس نے حافظ پر مضمون لکھا اور اقبال کی حمایت کی ۔ حضرت اکبر اسی حوالے سے مولوی صاحب کو تحریر کرتے ہیں ۔ " بھلا دیکھئے تو جو شخص حافظ کو بد کہے ، اس کو کیا کہوں ۔ مگر مجبوری

ہے "۔

ستمبر ۱۹۱۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

" اقبال صاحب کو آج کل تصوف پر حملے کا بڑا شوق ہے کہتے ہیں کہ عجم کی فلاسوفی نے عالم کو خدا قرار دے رکھا ہے ۔ یہ غلط ہے خلاف اسلام ہے ۔ میں نہیں جانتا یہ کیا ترنگ ہے "۔

(ص ۱۲۸)

" اسرار " کے ڈھائی تین برس بعد " رموز بیخودی " شائع ہوئی ، تو اکبر چونکہ پہلے سے برگشتہ خاطر تھے ، اسے دیکھنا نہ چاہتے تھے ۔ جون ۱۹۱۸ء میں ایک خط لکھتے ہیں ۔

" اقبال صاحب نے جب سے حافظ شیراز کو علانیہ برا بھلا کہا ہے میری نظر میں کھٹک رہے ہیں ۔ ان کی مثنوی اسرار خودی آپ نے دیکھی ہو گی ۔ اب مثنوی " رموز بیخودی " شائع ہوئی ہے میں نے نہیں دیکھی دل نہیں چاہا خط و کتابت ہے ۔ لیکن میں ان کے انقلاب طبیعت سے خوش نہیں ہوں ہونا اچھا ، بننا برا بہرحال کوئی serious معاملہ نہیں ہے دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے اور ان روزوں تو طوفان اختلاف برپا ہے:

میں سمجھا تھا براق راہ عرفاں
چو دم برداشتم لیڈر برآمد

(ص ۱۳۵)

یہ خطوط جن سے ہم نے حوالے نقل کئے ہیں ۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۸ء تک مختلف اوقات میں لکھے گئے تھے ۔ دیگر ہم عصروں کے نام جو خطوط اکبر مرحوم نے لکھے تھے ان میں بھی یہی گلہ کیا ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ حضرت اکبر نے جناب علامہ سے براہ راست بھی اس مسئلے پر کوئی خط و کتابت کی تھی

یا نہیں ۔ اگر خط و کتابت ہوئی بھی ہو تو موافق نتیجہ کوئی نظر نہیں آتا ۔ کیونکہ اکبر آخر دم تک اقبال سے بدظن رہے تھے ۔ گو ظاہراً تعلقات میں کوئی فرق نہ آنے دیا تھا ۔

اسرار کی اشاعت کے فوراً بعد کے زمانے میں علامہ سید سلیمان ندوی سے اقبال کی جو خط و کتابت ہوئی ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحب موافق تھے ۔ فارسی زباندانی اور عروض کی بعض لغزشوں کی طرف انہوں نے اقبال کی توجہ مبذول کرائی تھی ، لیکن یہ ایک علیحدہ چیز ہے ۔ مثنوی کے موضوع سے انہیں کوئی شدید اختلاف نہ تھا عجمی تصوف کے متعلق اقبال کا جو نقطہ نظر تھا سید صاحب اس سے بھی متفق نظر آتے ہیں ۔ جیسا کہ ان کے نام اقبال کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے ۔ یہ خط نومبر ۱۹۱۷ء میں لکھا گیا تھا ۔ فرماتے ہیں :

" آپ کا نوازش نامہ قوت روح اور اطمینان قلب کا باعث ہوا میں ایک مدت کے مطالعے اور غور و فکر کے بعد انہیں نتائج پر پہنچا ہوں جو آپ کے والا نامے میں درج ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوف کا وجود ہی سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے ، جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے ۔ "

(مکاتیب اقبال ص ۷۷ ۔ ۷۸)

دیگر معاصرین میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم مثنوی کی اشاعت پر بے حد مسرور ہوئے تھے ۔ اسی جوش مسرت کے زیر اثر ایک جگہ لکھتے ہیں : " خدا رحمت کرے اقبال پر ۔ مولانا رومی کی تعلیمات کا خوب اقدام کر رہے ہیں " ۔ پھر بے اختیار مثنوی اسرار کے تیس چالیس اشعار نقل کر گئے ہیں ۔

غالب کے مشہور ترجمان اور نقاد ڈاکٹر عبد الرحمان بجنوری خواجہ حافظ

کے متعلق اقبال کے ہم خیال تھے ۔ ان کا تبصرہ " اسرار و رموز " ایک نہایت خیال انگیز مضمون تھا اس میں وہ رقمطراز ہیں :

" اقبال کے نظریے کے مطابق موجودہ اسلامی ممالک کے تنزل کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے عمل کی زندگی کے بجائے " افلاطونی بے عملی" اختیار کرلی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " افلاطونیت جدیدہ " اور حافظ نے ان سے وہ احساس مسرت چھین لیا ہے جو " کچھ کرلو کا نتیجہ ہوا کرتا ہے " ۔

اسی مضمون میں دوسری جگہ فرماتے ہیں :

حافظ نے اپنے ناظرین کے نشہ آور جرعے میں اصلی شراب ٹپکا دی ہے ۔ اس کا دیوان بصیرت آموز ہونے سے زیادہ سکر آور ہے ۔ وہ ان کے خراب کرنے میں ممدو معاون ضرور ہوا ہے ۔ اس سے بہتوں نے شراب حقیقت کے بجائے شراب مجازی پی ہے ۔ اقبال کا حملہ دراصل اسی " اپیقوری رو " کے خلاف ہے ۔

ڈاکٹر بجنوری مثنوی کے بیحد مداح تھے ۔ اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کی عظمت کے وہ دل سے قائل تھے ۔ آخر میں فرماتے ہیں :

" جب مثنوی کا علم کلام ہر جگہ سمجھ میں آجائے گا تو تمام اسلامی دنیا میں وہ لہر چلے گی جس کا نتیجہ نہایت شاندار ہے ۔ اقبال ایک " پیغمبر " ہے ۔ وہ اسلام کے شاندار اور بے نظیر زریں ماضی کا علم رکھتا ہے اور مستقبل میں اس کی معاودت کا نظارہ کرتا ہے ۔ "

اقبال نے " اسرار خودی " میں عجمی تصوف اور حافظ کے متعلق اپنے خیالات قلمبند کرکے " وکیل " اور لکھنو کے " نیوایرا " میں مزید تشریح و توضیح کے طور پر کچھ مضامین لکھے تھے ۔ جن کا ذکر حضرت اکبر الہ آبادی مولوی عبدالماجد صاحب کے نام کے خطوط میں کرتے ہیں ۔ یہ مضامین افسوس ہے

کہیں نظر سے نہیں گزرے ۔ ممکن ہے ابھی تک " نیوایرا " اور " وکیل " کے بوسیدہ فائلوں میں دبے پڑے ہوں ۔

ان مضامین کے علاوہ بعض احباب کے خطوط میں بھی استفسار پر علامہ توضیح کر دیتے تھے ۔ مثلاً مولوی سراج الدین پال کے نام جولائی ۱۹۱۶ء میں لکھے ہوئے تین خطوط ہیں ۔ جن میں مولوی صاحب کو خواجہ حافظ پر ایک مفصل مضمون لکھنے کی ترغیب دیتے ہیں ، اور فرماتے ہیں " ہمیں ادائے فرض سے کام ہے ۔ ملامت کا خوف رکھنا ہمارے مذہب میں حرام ہے " ۔ پھر ایک اصول بتاتے ہیں ۔ " حقیقت یہ ہے ، کہ کسی مذہب یا قوم کے دستورالعمل و شعار میں باطنی معنی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستورالعمل کو مسخ کر دینا ہے ۔ "

(مکاتیب ص ۳۵)

پھر وہ تمام مآخذ گناتے ہیں ۔ جن سے ایک ایسا مضمون لکھنے میں مدد مل سکتی ہے آخری خط میں کیا سچی بات کہی ہے ۔

" یہ حیرت کی بات ہے کہ تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولٹیکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی ، اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا ۔ جس قوم میں طاقت و توانائی مفقود ہو جائے ۔ جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی ۔ تو پھر اس قوم کا نقطہ نگاہ بدل جایا کرتا ہے ۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترک دنیا موجب تسکین اس ترک دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی و کاہلی اور اس شکست کو جو ان کو تنازع للبقا میں ہو چھپایا کرتی ہیں خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ ان کی ادبیات کا انتہائی کمال لکھنو کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا ۔ "

(ص ۴۵)

مولانا عبدالماجد ، افسوس ہے کہ مثنوی اسرار کے عہد خلفشار میں خود " مسٹریت " اور " انگریزیت و الحاد " میں ڈوبے ہوئے تھے ۔ اور بقول خود " اسرار خودی کے کوچے ہی سے نابلد تھے " ۔ ورنہ ان کے قلم سے شاید جلد تر اسرار کے حق میں تبصرہ (۶) شائع ہو جاتا ۔

ہندوستان کے علماء میں سب سے پہلے شخص جس نے اسرار کی حمایت میں قلم اٹھایا اور ایک مبسوط تبصرہ نکتہ چینوں کا منہ بند کرتے ہوئے قلم بند کیا تھا ، حافظ محمدؐ اسلم جیراجپوری تھے ۔ حافظ صاحب کا یہ تبصرہ لکھنو کے الناظر میں فروری ۱۹۱۹ء میں شائع ہو کر نہایت مفید ثابت ہوا ۔ البتہ حافظ صاحب خواجہ حافظ کے متعلق اشعار سے خوش نہ تھے ، چنانچہ تبصرے میں لکھتے ہیں کہ " ڈاکٹر صاحب نے اس مثنوی میں خواجہ صاحب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اگر نہ لکھتے تو بہتر تھا " ۔ علامہ اقبال نے یہ تبصرہ الناظر میں دیکھا تو بے حد مسرور ہوئے اور ایک خط میں حافظ اسلم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا ع : دیدمت مردے دریں قحط الرجال ۔ اس خط میں اس اصول کی تشریح بھی کی ہے جس کے تحت حافظ پر اشعار لکھے تھے ۔ فرمایا :

" خواجہ ، حافظ پر جو اشعار میں نے لکھے تھے ۔ ان کا مقصد محض ایک لٹریری اصول کی تشریح و توضیح تھا ۔ خواجہ کی پرائیویٹ شخصیت یا ان کے معتقدرت سے سرو کار نہ تھا ، مگر عوام اس باریک امتیاز کو نہ سمجھ سکے اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر بڑی لے دے ہوئی ۔ اگر لٹریری اصول یہ ہو کہ حسن حسن ہے خواہ اس کے نتائج مفید ہوں خواہ مضر تو خواجہ دنیا کے بہترین شعرا میں سے ہیں ۔ بہرحال میں نے وہ اشعار حذف کر دیئے ہیں ۔ "

حافظ محمدؐ اسلم صاحب حذف اشعار سے خوش ہوئے تھے لیکن ساتھ ہی اردو دیباچے کے نذر حذف ہو جانے سے وہ راضی نہ تھے ۔ کیونکہ یہ دیباچہ ان

کے خیال کے مطابق " مفید اور دلچسپ تھا " کیمبرج کے پروفیسر نکلسن بھی دیباچہ کے متعلق علامہ اسلم کے ہمنوا تھے ، لیکن اقبال نے حذف کر دینا ہی بہتر خیال کیا ۔ وہ سمجھتے تھے کہ دیباچہ اور اشعار اپنا مقصد پورا کر چکے ہیں ۔ اس لئے انہیں حذف کر دینے میں کوئی قباحت نہیں ہے ۔

اسرار خودی کے موضوع پر مختلف مباحث مولانا ظفر علی خاں صاحب کے " ستارہ صبح " میں شائع ہوا کرتے تھے ۔ مولانا نظر بند (۷) ہو گئے ۔ رہائی پر " آفتاب " نکالا اور ستارہ ہمیشہ کے لئے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ۔ ورنہ توقع تھی کہ پیش نظر موضوع پر کچھ مزید روشنی پڑتی ۔

نوٹ نوٹ:

(۱) Development of metaphysics in Iran

(۲) Iqbal by Atiya Begum

۳۔ مقالاتِ اسلم

۴ ۔ مکاتیب اقبال اول ص ۵۲ ، ۵۴

۵ ۔ مقالات اسلم

۶ ۔ مولانا نے ۱۹۲۲ء میں اپنا تبصرہ چھپوایا تھا ۔ اقبال اس تبصرے کے لئے چشم براہ تھے

۷ ۔ مد : جہاں تک ہمارا خیال ہے مولانا نے پہلے پہل ہفتہ وار " ستارہ صبح " سرمائیکل اوڈوائر لفٹننٹ گورنر پنجاب کی اجازت سے نظر بندی ہی کے زمانے میں جاری کیا تھا ۔ " رہائی " کے بعد یہی اخبار لاہور سے روزانہ نکلنے لگا ۔ کوئی " آفتاب " نہیں نکلا لیکن ہفتہ وار " ستارہ صبح " کی طرح روزانہ " ستارہ صبح " کا موضوع بھی سیاست کے بجائے ادب و تنقید ہی تھا ۔ ممکن ہے علامہ اقبال نے خود مولانا سے تصوف کے متعلق کچھ مضامین لکھنے کو کہا ہو ، لیکن مولانا نے تصوف اور صوفیوں کے خلاف جس انداز سے ایک سلسلہ مضامین شروع کر دیا ، اس سے علامہ اقبال غالباً بیزار تھے ۔ صوفی حضرات نے بھی ان مضامین کی اشاعت پر وہ ہنگامہ برپا کیا کہ مولانا کو " ستارہ صبح " ہمیشہ کے لئے بند کرکے حیدر آباد کا رخ کرنا پڑا ۔ " ستارہ صبح " کے غروب ہوتے ہی جو " آفتاب" طلوع ہوا اس سے مولانا کا کوئی تعلق نہ تھا ۔ اس کے مدیر اور مالک مولانا وجاہت حسین جھنجھانوی تھے ۔ جو پہلے " زمیندار " اور اس کے بعد روز نامہ " ستارہ صبح " کے ارکان ادارت میں شریک رہ چکے تھے ۔ (مدیر محزن)

۲۷

اقبال اور گرامی

مولانا شیخ غلام قادر گرامی بر عظیم ہندو پاکستان کے ان آخری گنے چنے فارسی شاعروں میں سے تھے جن کا ذہنی اور روحانی خمیر پرانی وضع کے دینی مدرسوں اور مکتبوں اسے اٹھا تھا گرامی کی فنی اور ادبی تربیت انہی مکاتب اور چند و ضعدار بزرگوں اور عالموں کے فیضان صحبت کا نتیجہ تھی ۔ گو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے لاہور کے اورینٹل کالج سے منشی فاضل کی سندلی (۱) تھی لیکن مولانا کے حالات و اطوار اور ان کی روش کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جائے کہ انگریزی طرز کے مدرسوں اور کالجوں کی انہیں ہوا نہ لگی تھی تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہو گا ۔ البتہ زندگی کے نصف آخر میں جدید طرز کی تعلیم گاہوں یا ان کے فارغ التحصیل منتخب لوگوں سے ان کے تعلقات و مراسم قائم ہو گئے تھے ۔ اور وہ ان نئے فن کاروں اور فن شناسوں سے بہت کچھ متاثر بھی ہوئے تھے ۔ لیکن ان سب واقعات کے باوجود گرامی کو ہندی مسلمانوں کو قدیمی درس گاہوں ہی کی پیداوار سمجھنا چاہیئے ۔ گرامی کے معاصر بزرگ مولانا شبلی نے جو انہی کی طرح قدیم مدرسوں اور بزرگوں سے تربیت یافتہ تھے ، موجودہ نسل ، یا کم سے کم شمال مغربی ہندوستان میں انگریزی دور کی اولین ذہنی پیداوار کو جس حد تک متاثر کیا ہے ۔ اور ان کی اسلام اور اسلامی امور سے ہٹتی ہوئی توجہات کو از سر نو مجتمع کرنے کی جو سعی بلیغ کی ہے وہ قابل صد ستائش ہے گرامی کا حلقہ اثر بہت محدود تھا ، وہ صرف شاعر تھے ۔ شبلی کی طرح قدیم اسلامی علوم کا ماہر کامل اور ان سے متصادم ہونے والے جدید ثقافتی ، تمدنی اور فلسفیانہ مسائل کے نقاد نہ تھے شبلی کا بحیثیت شاعر کے گرامی سے

موازنہ کیا جائے تو شاید یہ بھی کہا جا سکے کہ شبلی کے "دستہ گل" اور "بوئے گل" کے اکثر اشعار اپنی شاعرانہ وارفتگی اور مستی و شوق کی وجہ سے گرامی کی غزلوں پر بھاری ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کے ہاں اچھے اشعار نہیں ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ گرامی کے خریطہ شعر میں سے بھی بعض ایسے اشعار نکل آتے ہیں جو شبلی کیا سعدی و حافظ کے کلام کے ساتھ رکھے جا سکتے ہیں ۔

اتنا تو بہرحال مسلم ہے کہ دہلی کی مغلیہ سلطنت کے آخری عہد میں تربیت حاصل کرنے والے عظیم فارسی شاعر مرزا غالب کے بعد اور برطانی استعمار کے عہد عروج و شباب میں پرورش پانے والے اور اس سرزمین میں فارسی شاعری پر مہر اختتام لگانے والے عظیم سخنداں اقبال سے پہلے جن دو بڑے فارسی شاعروں کا نام لیا جا سکتا ہے وہ شبلی اور گرامی ہی ہیں ۔ شبلی اور گرامی کا باہم فنی موازنہ اس وقت پیش نظر نہیں ہے یہ موضوع کسی اور وقت کے لئے اٹھایا جا سکتا ہے ۔ آج کا موضوع مولانا گرامی اور علامہ اقبال کے باہمی تعلقات اور ان کی باہمی شاعرانہ اثر اندازی و اثر پذیری کے واقعات پر روشنی ڈالنا ہے ۔

مولانا گرامی حضرت علامہ سے عمر میں بہت بڑے تھے ۔ ان کے اقبال سے انتہائی بے تکلفانہ تعلقات اور غیر رسمی نوعیت کے روابط سے کم از کم اتنا تو ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں بے مثال ہستیاں کس قسم کے مذاق اور طبائع کی مالک تھیں ان مراسم سے صاف طور پر گرامی کی بزرگانہ شفقت ، آزادہ روی ، صوفی منشی اور جوہر شناسی کی خصوصیات عیاں ہوتی ہیں ، اور اقبال کی نیاز کیشی بزرگوں سے عقیدت ، ان کی بجا و بے جا دلداری اور دوستانہ تعلقات میں سلامت روی کی صفات کا اظہار ہوتا ہے ۔ یہ دونوں بے

تکلف دوست اپنی عمروں کے محسوس تفاوت کے باوجود جب کبھی آپس میں مل بیٹھتے تھے تو ایک دوسرے کو اپنی ذاتی خوبیوں اور صلاحیتوں کے لئے بطور آئینہ استعمال کرتے تھے ۔ دونوں ہی کو اس عمل سے فائدہ ہوا ۔ ایک نے دوسرے کو ایک لحاظ سے متاثر کیا تو دوسرے نے پہلے کی دوسری سمت میں راہ نمائی کی ۔ اس اثر پذیری و اثر اندازی کی مثالیں دونوں کے کلام میں موجود ہیں اقبال چونکہ زیادہ ہمہ گیر و ہمہ داں واقع ہوئے تھے اس لئے وہ گرامی پر کچھ زیادہ ہی اثر انداز ہوئے ۔ گرامی کے تاثرات ان کے دیوان کی اکثر غزلوں اور ان کی رباعیات میں دیکھے جا سکتے ہیں ۔

یہ کہنا تو خیر مشکل ہے کہ مولانا گرامی کی ملاقات اقبال سے اول اول کب ہوئی اور کیونکر ہوئی ۔ البتہ بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ انجمن حمایت اسلام کے مشہور جلسوں میں باہم شناسائی پیدا ہوئی ہو گئی ۔ اقبال کے خطوط میں سب سے اول مولانا گرامی کا ذکر مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم کے نام ، ایک خط میں آیا ہے ۔ افسوس ہے کہ اس خط پر تاریخ درج نہیں ، لیکن خط کی عبارت اور مولانا شروانی کی ایک تحریر سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ خط ۱۹۰۳ء میں منعقدہ جلسے کے متعلق لکھا گیا تھا جس میں میر نیرنگ اور ناظر کے ساتھ مولانا گرامی بھی شریک ہوئے تھے ۔ اس خط کے آخری جملے یہ ہیں ۔ " مولانا گرامی میرے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں ، پوچھتے ہیں خط کس کو لکھ رہے ہو میں کہتا ہوں " حبیب " کو ، تو آپ فرماتے ہیں میرا بھی سلام لکھ دو ۔ آخر شاعر ہیں نا ! "

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ گرامی اور اقبال کے تعلقات پہلے سے قائم ہو چکے تھے ۔ دونوں ایک دوسرے کو خوب جانتے تھے ۔ اور ایک دوسرے کی طبیعت اور مذاق سے اچھی طرح واقف تھے ۔

اقبال، کی اولین شاعرانہ کوشش جو انہیں منظر عام پر لے آئی " مخزن " کے پہلے شمارہ میں جو اپریل ۱۹۰۱ء میں نکلا تھا شائع ہوئی تھی ۔ اس کے بعد اس رسالے میں ان کی دوسری نظمیں بھی نکلتی رہیں ، اور ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اپنے کو اسٹیج پر بھی پیش کرنا شروع کر دیا ۔ خیال ہوتا ہے کہ گرامی کسی ایسے ہی جلسے میں ان سے ملے ہوں گے ، اور پھر باہم التفات اور جذب و شوق نے مراسم بڑھا دیئے ہوں گے ۔

مولانا گرامی کا معمول تھا کہ جب بھی لاہور آتے اقبال کے ہاں ٹھہرتے شعر و شاعری کی محفلیں برپا ہوتیں ۔ گرامی دل کی بھڑاس نکالتے اور اپنی دھن میں بہت کچھ کہہ جاتے ۔ اقبال ابتدا ہی سے اداشناس واقع ہوئے تھے ۔ گرامی سے ان کی بے تکلفی اور بڈھے شاعر سے ان کا لطیف مزاح محفل میں جان ڈال دیتا ۔ گھر میں بھی گرامی کی بے پروا اور لا ابالی طبیعت عجیب و غریب گل کھلاتی ۔ علی بخش کہتا ہے میں پوچھتا مولانا آج کیا کھائیے گا ۔ فرماتے ، کھانے میں اور کچھ ہو نہ ہو شلجم کا سالن ضرور ہو ۔ اب کھانے کے موقع پر شلجم کا سالن سامنے آتا تو مولانا فوراً بگڑ جاتے اور ڈانٹ کر کہتے ۔ آج شلغم کل شلغم ہر روز شلغم ، علی بخش تم تو شلغم کھلا کھلا کر بڈھے گرامی کو مار ڈالو گے ۔ اب ان سے کون کہتا کہ آپ ہی نے تو شلغم پکانے کو کہا تھا ۔

انگلستان سے واپسی کے بعد مولانا گرامی کے نام علامہ کا ایک خط مارچ ۱۹۰۴ء کا لکھا ہوا یوں شروع ہوتا ہے ۔ " بابا گرامی سلام " ! پھر کسی استاد کا ایک شعر نقل کیا ہے جو گرامی ہی کی غزل فرسنگ است ، سنگ است کی زمین میں واقع ہوا ہے ۔ آخر میں اپنے شوق دید کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے ۔ " آپ رخصت پر کب آتے ہیں ۔ پنجاب میں کئی لوگ چشم براہ ہیں اور بالخصوص اقبال " ۔

معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کے اوائل ہی میں گرامی حیدر آباد کی سرکار سے وابستہ ہو گئے تھے ۔ وہاں کے درباری شاعر تھے ۔ مولانا غلام رسول مہر کی اطلاع کے مطابق کم و بیش تیس برس وہاں رہے ۔ میر محبوب علی خاں مرحوم نے تین سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر کر دی تھی ۔ جو میر عثمان علی خاں کے زمانے میں بھی جاری رہی اور مولانا کی وفات (۱۹۲۸ء) کے بعد اس کا کچھ حصہ ان کی بیگم کے نام بھی مقرر ہو گیا تھا ۔ حیدر آباد میں مولانا گرامی نے اکثر دوسرے رؤسا کو بھی اپنی طبیعت کی سادگی اور سلیم الفطرتی سے بڑی حد تک متاثر کیا تھا ۔ خصوصاً مہاراجہ سرکشن پرشاد (۲) شاد اور نواب صدر یار جنگ مولانا شروانی تو ان کی بے حد عزت کرتے تھے ۔

گرامی رخصت پر پنجاب میں آتے تو لاہور میں اقبال کے پاس کچھ عرصہ ضرور ٹھہرتے اور بعض اوقات ان کے ساتھ انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں بھی شرکت کرتے کسی ایسے ہی موقع پر گرامی نے کہا تھا :

اقبال کہ نظم او ادب پیغام است
سر جلوہ آغاز وفا انجام است
برخیز کہ جلوہ ریز آں جوہر فرد
در انجمن حمایت اسلام است

مولانا عبد المجید سالک نے اپنے ایک مضمون میں انجمن حمایت اسلام کے اجلاس منعقدہ ۱۹۱۳ء کا ذکر کیا ہے جس میں اقبال مولانا گرامی کو لوگوں سے ان الفاظ میں متعارف کراتے نظر آتے ہیں :

" ہندوستان میں فارسی کا ذوق روز بروز انحطاط پذیر ہے اور یہی وجہ ہے کہ ابنائے وطن مولانا گرامی کے پایہ شناس نہیں ہیں ۔ حالانکہ یہ یگانہ روزگار شاعر عرفی و نظیری کا ہم پلہ واقع ہوا ہے اور ارباب ذوق

سلیم پر یہ حقیقت بالکل واضح ہے ۔ آج گرامی کو سن لو کل فخر کرو گے
کہ ہم نے گرامی کو سنا ہے "۔

پھر مولانا گرامی جو ہلکے گلابی رنگ کی بھاری پگڑی باندھے ، حیدر آبادی شیروانی پہنے ، حناشدہ داڑھی کو دو حصوں میں تقسیم کئے ہوئے ہیں نہایت لا ابالیانہ انداز سے اٹھتے ہیں ، اور اپنے مخصوص انداز میں یہ مثنوی سناتے ہیں :

نے کہ نالانست بیش از چوب نیست
چوب نالد دل نہ نالد خوب نیست
داستان بیخودی از مے بہ پرس
قصہ ہائے بے دلی از نے بہ پرس

مثنوی کے بعد مولانا اپنی وہ مشہور غزل بھی سناتے ہیں جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں :

تو اسرار دل آگاہ از غافل چہ می پرسی
رموز قعر دریا از لب ساحل چہ می پرسی
دلم آفت بجان آورد حرف از جان چہ می رانی
بجان افتاد کارم ماجرائے دل چہ می پرسی
نخوردی زخم شوق انتظار جلوہ قاتل
ز انداز بخون غلطیدن بسمل چہ می پرسی
چہ می پرسی گرامی معنی درد از تہی مغزان
حدیث شورش گرداب از ساحل چہ می پرسی

مکاتیب اقبال میں گرامی کے نام کا دوسرا خط اکتوبر ۱۹۰۸ء کا لکھا ہوا ہے جبکہ گرامی ابھی سرکار حیدر آباد ہی سے وابستہ تھے ابتدایوں ہوتی ہے :

" گرامی کو خاک پنجاب جذب کرے گی یا خاک دکن گرامی

مسلم ہے اور مسلم تو وہ خاک نہیں کہ خاک اسے جذب کر سکے ۔ یہ ایک قوت لوزانیہ ہے جو جامع ہے جواہر موسویت اور ابراہیمیت کی ۔ آگ اسے چھو جائے تو برد و سلام بن جائے ۔ پانی اس کی ہیبت سے خشک ہو جائے ۔ آسمان و زمین میں یہ سما نہیں سکتی کہ یہ دونوں ہستیاں اس میں سمائی ہیں ۔

پورا خط پڑھنے کے قابل ہے ، مکاتیب اقبال میں ایسے خط بہت کم ملتے ہیں جن میں افکار عالیہ کو اتنے رواں اور برجستہ انداز میں قلمبند کیا گیا ہو ۔ یہ خط اقبال کے اردو طرز نگارش کی ایک بلند اور مؤثر مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے ۔ خط کے آخری جملے بھی یہاں درج کئے جاتے ہیں :

" مسلم جو حامل ہے محمدیت کا اور وارث ہے موسویت کا اور ابراہیمیت کا کیونکر کسی شے میں جذب ہو سکتا ہے البتہ اس زمان و مکان کی مقید دنیا کے مرکز میں ایک ریگستان ہے جو مسلم کو جذب کر سکتا ہے اور اس کی قوت جاذبہ ذوقی یا فطری نہیں بلکہ مستعار ہے ایک کف پا سے جس نے اس ریگستان کے چمکتے ذروں کو کبھی پامال کیا تھا " ۔

سبحان اللہ کیا زبان ہے اور کیا کیا نکات ارشاد ہوئے ہیں ۔

یہ تو اقبال کی عقیدت کیشی اور بڈھے گرامی سے والہانہ محبت کا حال ہے ، دوسری جانب سے گرامی بھی اقبال کی محبت کا جواب انتہائی التفات سے دیتے تھے ۔ " اسرار خودی " جب زیر تصنیف تھی تو فارسی شعر کی نوک پلک کے سلسلے میں علامہ نے مولانا سے بہت مدد لی ۔ " آدمی بھیج کر بلا لیتے تھے اور کئی کئی دن مہمان رکھتے تھے ۔ " ۱۹۱۸ء میں " رموز بیخودی " چھپی تو اکثر پڑھنے والوں کے دل میں " اسرار خودی " کی لگائی ہوئی آگ پر تیل کا کام دیا اور بعض

لوگوں نے مارے حسد و بغض کے اقبال کو نہ معلوم کیا کیا خطاب دے دیئے گرامی نے اپنے رنگ میں جوہر شناسی کی اور پانی کے بہاؤ کا ذیل کی رباعیوں سے مقابلہ کیا:

از گلبن عقل گر نچیدیم گلے
در گلشن دہر زندگانی مرگ است
واللہ " رموز بیخودی " فکر حکیم
گر فہم فکر و نکتہ دانی مرگ است

اور

آں ابلہ کہ کعبہ از کلیسا نشناخت
یار آمد و نشناخت ہمانا نشناخت
نشناخت " رموز بیخودی " مفتی شہر
او را چہ شناسد آنکہ خود را نشناخت

اپریل ۱۹۱۹ء میں علامہ نے گرامی کی ایک غزل " معارف " میں اشاعت کی غرض سے سید سلیمان ندوی کی خدمت میں بھیجی تھی چند اشعار درج کئے جاتے ہیں:

پنہانم و پیدایم کیفم بشراب اندر
پیدائم و پنہانم داغم بکباب اندر
از موی من می پرس از غیر چہ می پرسی
شوقم بسوال اندر ذوقم بجواب اندر
آں نکتہ کہ عارف را آورد بوجد این است
جانست بجسم اندر دریا بہ حباب اندر
دیدیم گرامی را در خلد برین امشب

ابلہ بہ بہشت اندر دانا بعذاب اندر

معلوم ہوا ہے کہ گرامی نے یہ غزل سرکشن پرشاد کی جاگیرالوال کے کسی مشاعرے کے سلسلے میں کہی تھی جس کے لئے اسی بحر اور ردیف و قافیہ کا مصرع طرح دے دیا گیا تھا۔ سید نور الضیاء الدین نے بھی اسی مصرع طرح پر غزل کہی تھی۔ ایک شعر یہ ہے:

ایں کیف کجا باشد ساقی بشراب اندر
گہ گرید و گہ خندد مست تو بخواب اندر

مفتی ضیا یار جنگ اس زمانے میں حیدر آباد میں غالباً امور مذہبی کے ناظم تھے اور گرامی کے کر مفرماؤں میں سے تھے ۱۹۲۲ء میں اقبال "سر" ہوئے تو کسی نے استہزا کیا، کسی نے پھبتی کہی۔ ہم مجلس وہم راز تک کو بدگمانی ہوئی۔ ایسے ہی ایک صاحب نے کہا: سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبال۔ یہاں تک کہ خود علامہ کو میر غلام بھیک نیرنگ کے نام ایک خط میں لکھنا پڑا:

"باقی رہا وہ خطرہ جس کا آپ کے قلب کو احساس ہوا ہے سو قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضے میں میری جان اور آبرو ہے اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی جس کی وجہ سے مجھے خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں دنیا کی کوئی قوت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ انشاءاللہ!"

گرامی کو خبر ہوئی تو کہا:

ہر نکتہ علامہ وفا آہنگ است
ہر حرف کلید حکمت و فرہنگ است
اقبال سر اقبال شد از جوہر علم
حاسد عو عو کند علاجش سنگ است

گرامی کی ایک غزل ہے بسلم پرفشانی ہم ہست ، میرم و سخت جانی ہم ہست ، زندگانی ہم ہست ، لن ترانی ہم ہست،جاں فشانی ہم ہست ، وغیرہ ۔ جب یہ غزل اول اول کہی گئی تھی تو مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ اقبال کی توجہ اس کی طرف مبذول کرائی ۔ علامہ یہ غزل پہلے ہی سن چکے تھے ۔ انہیں اس غزل کا یہ شعر خاص طور پر پسند تھا :

ماہ را بر فلک دو نیم کند
فقر را ترکمانی ہم ہست

اس شعر پر علامہ نے تضمین بھی لکھی تھی اور اسے " پیام مشرق میں داخل کرنے کا خیال تھا ۔ لیکن چونکہ بعض اشعار کی بندش انہیں خود پسند نہ تھی اس لئے شائع نہ کی گئی تضمین درج ذیل ہے :

سخنے راندہ کہ جز قرشی
بہ سر منبر نبیؐ نہ نشست
درس گیر از گرامی ہمہ درد
کہ برید از خود و بہ او پیوست
رمز ترک خلافت عربی
گفت آں میگسار بزم الست
ماہ را بر فلک دو نیم کند
فقر را ترکمانی ہم ہست "

جس زمانے میں اقبال " پیام مشرق " کی تصنیف میں رات دن مصروف تھے اسی زمانے کا گرامی سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ مکاتیب اقبال جلد اول میں درج ہوا ہے ۔ جناب اسد ملتانی صاحب نے ایک نظم " شبنم کا قطرہ " اپنے ایام کالج کے سالانہ انعامی مقابلے میں پیش کی تھی ۔ اس انعامی مقابلے کا

فیصلہ علامہ اقبال نے فرمایا ۔ " شبنم کا قطرہ " اول نکلی ۔ جب یہ نظم مصنف کو واپس ملی تو اس پر جا بجا اصلاح کے نشان موجود تھے جو علامہ نے اپنی طرف سے لگا دیئے تھے ۔ جناب اسد صاحب اسی نظم کے سلسلے میں انارکلی والے مکان میں علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ علامہ ایک واقف کار سے اپنی فارسی زبان کی تحصیل پر گفتگو کر رہے تھے ۔ مولانا گرامی کا ذکر آگیا ۔ علامہ نے ان کے حافظے کی بہت تعریف کی اور فرمایا ۔ " کسی کو اشعار ، غزلیں یا نظمیں یاد ہوں گی مگر مولانا کو مثنویاں تک مسلسل یاد ہیں ۔ مولانا چونکہ قریب ہی پلنگ پر لیٹے تھے ان کے حافظے کے امتحان کے لئے علامہ نے ان کو آواز دی ۔ وہ اٹھ بیٹھے ۔ کہا کہ مولانا حضرت نظامی نے وہ کیا فرمایا ہے : نہ گرد بیاباں بیابان گرد ۔ بس اس مصرع کا سننا تھا کہ مولانا گرامی دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیاں اٹھا کر جھومنے لگے اور کہنے لگے اللہ اللہ ! اللہ اللہ ! اس کے بعد ایک دوبار اس مصرع کو دوہرایا اور پھر وہیں سے مثنوی شروع کر دی ۔ مزے لے لے کر شعر پر شعر پڑھنے لگے ۔ اسد صاحب لکھتے ہیں ۔ " میں نے مولانا گرامی کو پہلی اور آخری بار جبھی دیکھا ۔ ان کا گھٹا ہوا سر ، اٹھی ہوئی انگلیاں ، نیم وجد کا عالم ۔ جھوم جھوم کر زور دار اور پرجذب آواز سے شعر پڑھنا یہ تمام منظر اب تک میرے تصور پر نقش ہے یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا اور شاید بہت دیر تک جاری رہتا لیکن ۔ آخر حضرت علامہ نے اپنی خوش اسلوبی سے موضوع بدل کر گفتگو کا رخ کسی اور طرف پھیر دیا ۔ "

پیام مشرق جب لکھی جا رہی تھی تو علامہ اس کے اکثر اجزا اشاعت سے پہلے گرامی کو بھی دکھا دیتے تھے ، اور ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھاتے تھے ۔ گرامی اس لاجواب کتاب کی تعریف میں رطب اللساں تھے ۔ اسی زمانے میں انجمن حمایت اسلام کا جلسہ ہوا گرامی نے ایک مثنوی پڑھی ۔ نواب

ذوالفقار علی خاں اور سر فضل حسین کے ذکر کے ساتھ علامہ اقبال کا ذکر بھی اس میں کیا:

حکمت آموز حال و استقبال
وہ چہ علامہ ایست سر اقبال
می دہد جلوہ حال را در قال
گوئے را جواب سر اقبال

گرامی کی عادت تھی کہ عموماً غور و فکر میں ڈوبے رہتے تھے ۔ چلنے پھرنے سے سخت متنفر تھے جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے میں نے ایک خط میں مولانا غلام رسول مہر سے گرامی کی سب سے بڑی خصوصیت پوچھی تو انہوں نے لکھا:

"میرے نزدیک مولانا کی خصوصیت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ میں نے ان سے بڑھ کر فنافی الشعر آدمی کوئی نہیں دیکھا"۔

ان کی دنیوی امور سے بے خبری کے متعلق کئی لطیفے لوگوں کو یاد ہیں ان لطیفوں کو تحریر میں لانا غالباً مناسب نہیں ہے ۔ بارہا ایسا ہوا کہ علامہ نے مولانا کو (روانگی کے لئے ان کی ضد کے باوجود) اپنے ہاں زیادہ عرصے مہمان رکھنے کے لئے کسی مصرع پر دوسرا مصرع لگانے کو کہہ دیا گرامی دنیا ومافیہا کو بھول گئے اور سرتاپا فکر مصرع ثانی میں ڈوب گئے ۔ علامہ یہ واقعات ہنس ہنس کر اپنے ہم نشینوں کو سنایا کرتے تھے ۔

مارچ ۱۹۱۹ء میں سرکشن پرشاد کی خدمت میں اور اپریل ۱۹۱۹ء میں مولانا اکبر الہ آبادی کی خدمت میں اقبال نے ایک مصرع بھیجا کہ اس پر دوسرا مصرع لگائیے مصرع تھا:

این سر خلیل است بآذر نتواں گفت

شاد کے خط میں ذکر ہے کہ یہ مصرع مولانا گرامی کے پاس بھی ارسال کیا ہے اکبر مرحوم اور شاد آنجہانی کے فکر مصرع ثانی کے متعلق ہمیں خبر نہیں ہے ۔ البتہ گرامی مرحوم نے اس مصرع کی زمین اور قافئے میں تیرہ اشعار کی ایک غزل لکھ ڈالی تھی ۔ یہ غزل دیوان گرامی میں موجود ہے اور اس میں علامہ اقبال کے متعلق گرامی کا مشہور زماں شعر بھی ہے ۔ چیدہ اشعار پیش کئے جاتے ہیں :

عشق آمد و از عقل فسوں گر نتواں گفت
پیداست کہ از پنبہ و اخگر نتواں گفت
ما خم کش دیرینہ سرجوش الستیم
با ما سخن از شیشہ و ساغر نتواں گفت
آن رمز جلیل است ابوجہل چہ فہمد
آن سر خلیل است بآذر نتواں گفت
در دیدہ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت
ایں است سخنہائے گرامی اگر این است
شاعر نتواں خواند و سخنور نتواں گفت

اسی اپریل میں لکھا ہوا نیاز الدین خاں صاحب کے نام علامہ کا ایک مکتوب ہے جس کا سر عنوان گرامی کا یہ شعر ہے :

عصیان ما و رحمت پروردگار ما
این را نہایتے است نہ آں را نہایتے

اس شعر کی تعریف خود اقبال کے الفاظ میں سنئے :

" ۔ ۔ ۔ ۔ شعر مندرجہ عنوان نے بے چین کر دیا سبحان اللہ !

گرامی کے اس شعر پر ایک لاکھ دفعہ اللہ اکبر پڑھنا چاہیئے خواجہ حافظ تو ایک طرف مجھے یقین ہے پورے فارسی ادب میں اس پائے کا شعر کم نکلے گا ۔ انسان کی بے نہایتی کا ثبوت دیا ہے ، مگر اس انداز سے کہ موحد کی روح فدا ہو جائے ۔ اس میں شک نہیں کہ انسان بھی بے نہایت ہے اور یہی صداقت مسئلہ وحدت الوجود میں ہے ۔ شاعر نے اس حقیقت کو اس خوبی سے نمایاں کیا ہے کہ پڑھنے والے پر اسلامی حقائق کا انکشاف ہو جاتا ہے یہی ہے کمال شاعری جو الہام کے پہلو پہلو ہے ۔"

پھر اسی غزل کے ایک شعر کے مصرع ثانی :

تمہید نیم خند تو مرگ دلایتے

کے متعلق فرمایا ہے :

"اگر یہ شعر مطلع ہوتا تو خواجہ (حافظ) کی پوری غزل کا جواب ہوتا اور اگر یہ مصرع خواجہ کو سوجھتا تو وہ اس پر فخر کرتے ۔ البتہ پہلے مصرع میں جو "ان" ہے اس کو کسی نہ کسی طرح نکالنا چاہیئے (عنوان آں نگاہ ۔ ۔ ۔ ۔) یہ مشورہ مولانا کی خدمت میں پیش کیجیئے" ۔

غالباً اسی مشورے کا اثر تھا کہ دیوان میں یہی شعر اب یوں ہے :

عنوان یک نگاہ تو خونریز عالے
تمہید نیم خند تو مرگ دلایتے

خط کے آخر میں اسی شعر کے متعلق فرمایا ہے :

"شعر مندرجہ کے اثر سے دل سوز و گداز سے معمور ہے ۔ گرامی صاحب

اپنے شعر کا اثر دیکھتے تو نہ صرف میری ولایت کے قائل ہو جاتے بلکہ اپنی ولایت میں بھی انھیں شک نہ رہتا" ۔

(مکاتیب جلد دوم ۔ ص ۳۱۹)

یہ طرفین کی اداشناسی اور بجا تعریف و تحسین " من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو " کا نتیجہ نہیں بلکہ دونوں طرف کے خلوص اور گہرے روحانی تعلقات کا نتیجہ تھی ۔ اقبال نے گرامی کی بڑی قدر شناسی کی لیکن گرامی اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی فراخدل واقع ہوئے تھے ، تحسین و تبریک کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے ۔ یہاں تک کہ جاوید اقبال کی پیدائش پر گرامی نے دو رباعیاں کہیں ۔ اور اس صاحبزادے کو " سرو باغ اقبال " اور " بالیدہ در آغوش ادب مثل بلال " ، " سر خط رموز معنی دانش و عقل " اور " سر جلوہ ذوق نکتہ ماضی و حال " کہہ کر پکارا ۔

رباعیات گرامی میں کلام اقبال پر ایک اور رباعی بھی موجود ہے :

الہام بود ہمہ کلام اقبال
شہباز معانی است بدام اقبال
سر بر خط او نہد گرامی کہ قضا
زد سکہ خسروی بنام اقبال

آخر میں دیوان گرامی کی نظم " سر اقبال گرامی کی نظر میں " درج کرکے مضمون ختم کیا جاتا ہے :

درس ماضی از کتاب حال گیر
ساغر از خمخانہ اقبال گیر
حضرت اقبال آن بالغ نظر
دارد از بود و نبود ما خبر

ما بذوق سوختن کم ساختیم
بیخودی را از خودی نشناختیم
آن نوا پرداز اسرار ازل
شهسوار عرصه علم و عمل
بیخودی را در خودی منزل شناس
در غبار کارواں محمل شناس
از نوایش بزم یورپ در خروش
حکمت امریکه او را سفته گوش
نالہ ہائے آتشین آں حکیم
سوخت رخت فتنہ امید و بیم
ساخت با دلہا و بودش ہیچ نیست
سوخت دلہا را و دودش ہیچ نیست

اہل نظر دیکھ سکتے ہیں کہ اقبال کا رنگ اس نظم میں کتنا نمایاں ہے۔

نوٹ نوٹ:

(۱) بحوالہ مولانا غلام رسول مہر،

(۲) شاد کی عنایات کا ذکر مولانا یوں کرتے ہیں:

" تا قیامت " باز خوانم ہر سحر

سر مہاراجہ کشن پرشاد " شاد "

الحمراء کی سرزمین

سائنسی علوم کا گہوارہ

ہسپانیہ تو خون مسلماں کا امیں ہے
مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں
(اقبال)

کہتے ہیں جب طارق بن زیاد فاتح اندلس اپنے مجاہدوں کو ساتھ لے کر اسپین کے ساحل پر اترا تو اس نے اپنے تمام جہاز نذر آتش کر دیئے ۔ دشمن کی کثیر فوج مقابلے کے لئے سامنے کھڑی تھی ۔ طارق نے اپنے مایوس سپاہیوں کا دل بڑھانے اور ان کا جذبہ شہادت ابھارنے کے لئے ایک بلیغ خطبہ دیا جس کا مفہوم یہ تھا:

" اے اسلام کے حامیو ! سمندر تمہارے پیچھے اور دشمن تمہارے سامنے ہے اب تم کو صرف تلوار کی دھار سے نجات مل سکتی ہے " ۔

اس سے زیادہ اس نے اور کچھ نہیں کہا ۔ مسلمان مجاہد جو ایک لمحہ پہلے مایوسی اور نا امیدی کے سمندر میں ڈوبے ہوئے تھے اب ان کے دل جذبہ شہادت سے معمور ہو چکے تھے ۔ وہ اللہ کا نام لے کر دشمن کی صفوں میں گھس گئے ، اور نتیجہ مسلمانوں کی عظیم الشان فتح کی صورت میں نکلا ۔ تاریخ اس واقعے کو کبھی نہیں بھلا سکے گی بلکہ اس پر ہمیشہ ناز کرے گی ۔ مرحوم علامہ اقبال نے اس پورے واقعے کو تین شعروں میں ہمارے لئے محفوظ کر دیا ہے ۔

یہ اشعار اس قابل ہیں کہ انہیں اپنے دلوں میں محفوظ کرکے اپنے سینے روشن کرلیں:

طارق چو بر کنارہ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کار تو بنگاہ خرد خطاست
دوریم از سواد وطن باز چوں رسیم
ترک سبب ز روئے شریعت کجا رواست ؟
خندید و دست خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

طارق کا کشتیوں کو جلا دینے کا یہ جرات آموز واقعہ اسلام میں وطن کی اصل حیثیت کو واضح کرنے میں بہت بڑی " علامتی " اہمیت کا حکم رکھتا ہے ۔ ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست ، کی اس سے زیادہ جامع تفسیر اور کیا ہو گی !

آٹھویں صدی عیسوی کے نصف اول میں اسپین کے بڑے حصے پر مسلمانوں کا پورا پورا قبضہ ہو گیا ۔ سب سے پہلے جس شخص نے خلیفہ کا لقب اختیار کیا خاندان بنی امیہ کا عبدالرحمن ثالث (۹۱۲ء تا ۹۶۱ء) تھا ۔ " اس کے بیٹے الحکم ثانی کے زمانے میں یہاں اموی سلطنت کا جاہ و جلال نقطہ نصف النہار پر پہنچ گیا ۔ دسویں صدی ہسپانیہ کے لئے ویسی ہی تھی جیسی نویں صدی مشرق کے لئے یعنی بہترین مادی اور ذہنی تمدن کا زمانہ بلکہ یہاں اسلامی تہذیب زیادہ تازہ دم اور قرین فطرت تھی (۱) "

دیوئر کا خیال ہے کہ اسپین میں مسلمانوں کا ذہنی تمدن ہمیشہ مشرق کا پابند رہا ۔ مغرب (۲) کے طالب علم اپنی روحانی پیاس بجھانے کی خاطر مصر کا سفر کرکے مشرق (۳) میں پہنچتے تھے اور یہاں کے علمی سرچشموں سے سیراب ہو

کر وطن لوٹتے تھے ۔ شروع شروع میں قرطبہ وغیرہ میں جتنے بھی کتب خانے قائم کئے گئے ان کے لئے کتابیں مشرق ہی سے نقل کرا کر منگائی گئیں ۔ کہتے ہیں خلیفہ الحکم کے زمانے میں ایسی چار لاکھ کتابیں مشرق سے درآمد کی گئیں ۔ البتہ مشرق اور مغرب کی تہذیبوں میں ایک بات جو واضح طور پر مابہ الامتیاز نظر آتی ہے یہ ہے کہ مشرق کے فلسفے الہیات اور کلامی مسائل کے بجائے مغرب میں سائنسی علوم مثلاً ریاضی ، ہیئت ، طبیعیات ، کیمیا ، طب ، نباتیات وغیرہ کو زیادہ فروغ ہوا ۔ اس کے بھی وجوہ ہیں ۔ مشرق میں خلافت کے سربراہوں کی حد سے بڑھی ہوئی روا داری ، آزادہ روی اور اعتزال پسندی نے بے شمار فرقے پیدا کر دیئے جن کی بے لگام " آزادی افکار " نے مذہب میں ان گنت رخنے ڈال دیے پھر ان رخنوں نے بڑھتے بڑھتے ایسی فضا پیدا کر دی کہ اصل اسلام کو اس میں سانس لینا دشوار ہو گیا ۔ مغرب میں یہ نوبت نہیں آئی نہ تو یہاں گوسفندی فلسفے کا رواج ہوا اور نہ مشرق کے تصوف اور معتزلی علم کلام ہی نے اس سرزمین میں جڑ پکڑی ۔ لوگ سیدھے سادے مسلمان تھے اور زیادہ تر مالکی مذہب کے پیرو ، وہ مذہب میں عقل و فکر کی دخل اندازی کو پسند نہیں کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ چند فلاسفر جو یہاں پیدا ہوئے یا تو خوف خلق سے وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے یا اپنے افکار کی زیادہ اشاعت نہ کر پائے اور اپنے خیالات کو اپنے ساتھ لے کر پیوند خاک ہو گئے ۔ آخری عہد میں یہودیوں کی تحریک سے فلسفیانہ علوم مسلمانوں میں سرایت کرنے لگے ۔ اور ابن ماجہ ، ابن طفیل ، ابن رشد اور ابن خلدون جیسے فلسفی پیدا ہوئے ۔ لیکن ان میں سوائے ابن خلدون کے کسی کا فلسفہ بعد کی نسلوں کے لئے زیادہ مفید ثابت نہ ہوا ۔

جیسا ابھی بیان ہوا مغرب کا طغرائے امتیاز فلسفی علوم نہ تھے بلکہ یہاں

سائنسی علوم کو زیادہ رواج ہوا ۔ یہاں کے سائنسی علوم کی تاریخ اور ارتقاء کا مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ قرون وسطیٰ کا اندلس مشرق سے بہت آگے نکل گیا تھا ۔ مشرق تو مشرق پوری دنیا میں کوئی خطہ زمین سائنس کی ترقی میں اندلس کی برابری نہ کر سکتا تھا ۔ اس ضمن میں تو باقی دنیا کا ذکر ہی کچھ ناروا معلوم ہوتا ہے ۔ اور کہیں علم کی روشنی تھی کہاں جو اس کا اس نور سے مقابلہ کیا جائے ۔ جو اندلس کی سرزمین سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہا تھا ۔ اس عہد کے قرطبہ کو جو " دنیا کا نور " کہا گیا ہے تو کچھ غلط نہیں کہا گیا ۔

آج کے مضمون میں اندلسی تمدن کے اسی پہلو کا ذکر مقصود ہے ۔ اس سے پہلے کہ ہسپانوی مسلمانوں کے علوم کا جائزہ لیا جائے لازم ہے کہ سائنسی غور و فکر کے متعلق چند باتیں ذہن میں بٹھا لی جائیں ۔

جیسا کہ معلوم ہے تمام سائنسوں کی بنیاد تجربے اور مشاہدے پر ہے ۔ سائنس میں پہلے پہل ایک قیاس یا مفروضہ پیش کیا جاتا ہے ۔ پھر مفروضے کو مسئلہ ثابت کرنے کے لئے ہر چہار طرف سے شواہد پیش کئے جاتے ہیں ۔ اگر ایسے ہمہ گیر شواہد مل جائیں جو مفروضے کے پیش کردہ نقاط کی بہمہ وجوہ تائید کریں تو علماء مفروضے کو بطور ایک سائنسی اصول مان لیتے ہیں ۔ اور آئندہ تمام متعلقہ امور میں اسی سائنسی اصول کو نگاہ میں رکھتے ہیں ۔ اور اس سے استفادہ کرتے ہیں ۔

بیرونی شواہد کی تلاش سائنسی علوم میں جتنی اہم ہے یونانی علماء اس کی اہمیت سے اتنے ہی ناواقف تھے ۔ اس کی توجیہ غالباً یوں کی جا سکتی ہے کہ نہ تو ان کے پاس وقت کے چھوٹے چھوٹے وقفے ماپنے کے ذرایع تھے ، نہ حسابی اعداد کا کوئی اچھا نظام تھا نہ جانچنے کی صحیح میزانیں تھیں اور نہ انہیں دوربین اور خوردبین کے ابتدائی اصولوں ہی سے واقفیت تھی ۔

یونانی دراصل ضرورت سے زیادہ نظریہ پرست واقع ہوئے تھے ۔ اس کا بڑا سبب ان کا فلسفیانہ مذاق ہو سکتا ہے استدلال ان کی گھٹی میں پڑا تھا ۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کا استدلال اکثر فلسفیانہ موشگافیوں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے اور حقائق اشیاء تک پہنچنے کے لئے ان کی راہنمائی نہیں کرتا ۔ یہی وجہ ہے کہ یونانی علماء بیرونی شواہد اور تجربات کی طرف بہت کم مائل ہوئے وہ اپنے آثار میں مختلف فلسفی نظام تو چھوڑ گئے ہیں ، مگر سائنس میں ان کی کوئی قابل قدر یادگار باقی نہیں ہے ۔

یونانیوں کی میراث عربوں کے ہاتھ آئی عربوں نے سائنس کے میدان میں ہندسہ اور استخراجی استدلال کے اصولوں کے سوا یونانیوں سے کچھ نہیں سیکھا لیکن جیسا اوپر ذکر ہوا سائنس میں استدلال ہی کافی نہیں ہوتا ۔ مفروضے کو مسلمہ ثابت کرنے کے لئے بیرونی شواہد بنیادی طور پر اہم ہوا کرتے ہیں ۔ یونانی اس معاملے میں حد درجہ ناقص تھے ۔

اسلام اور خدا کی کتاب نے یہ حقیقت عربوں کے ذہن نشین کی کہ کائنات ایک عظیم الشان منصوبے کے مطابق حرکت کر رہی ہے ۔ اس کے مختلف اجزاء میں ترتیب ہے ۔ تنظیم ہے اور ضبط ہے اور یہ سب اجزاء مل کر ایک عالمگیر بامقصد نظام کی صورت میں بندھے ہوئے ہیں قرآن کے الفاظ تفقہ تدبر ، تفکر اور تعقل کا منشایہ بھی تھا کہ لوگوں کو کائنات کے اسرار ڈھونڈنے کی ترغیب دی جائے تاکہ کائنات کی تعمیر میں جس حکمت اور کمال فن کا اظہار ہوا ہے اسے محسوس کرکے وہ شعوری طور پر اس ذات کا اقرار کرلیں جو اس کی خالق اور فاطر ہے ۔ قرآن نے یہ بھی واضح کیا کہ قدرت کے اصول اٹل ہیں ۔ تغیر پذیر نہیں ، اور ان کی کچھ نہ کچھ غایت ہے بے معنی نہیں ہیں ۔ غرضکہ اسلام نے سائنسی غور و فکر کی ترویج و ترغیب کے لئے ذیل کی دو باتوں پر زور

دیا:

ا۔ کائنات معنی خیز اور معین اصولوں کے ماتحت حرکت کر رہی ہے۔

ب۔ یہ اصول غیر متغیر ہیں۔

دراصل یہی وہ بنیادی باتیں ہیں جن پر سائنسی تحقیق کی بنیاد رکھی گئی عربوں نے انہی کو اساس مان کر مشاہدے اور استدلال کی مدد سے فطرت کے اسرار کا انکشاف کیا۔

سائنسی علوم کی کوئی بڑی شاخ ایسی نہیں ہے جس پر عربوں نے توجہ نہ کی ہو۔ میکانیات میں علم سکون سیالات سے لے کر علم المناظر اور حیوانیات تک سبھی ان کے فیض طبع سے مستفید ہوئے اور یہ سب اسی سائنسی روح Scientific Spirit کا نتیجہ تھا۔ جسے عربوں نے قرآن سے سیکھا اور جسے آج اہل یورپ مغربی تمدن کی سب سے بڑی خصوصیت سمجھتے ہیں

جرمن مصنف جوزف ہل نے اپنی کتاب "تہذیب عرب" (۴) میں لکھا ہے۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ عرب ذہن کا سب سے نمایاں وصف کیا ہے تو جواب دوں گا "حقائق کا مقابلہ کرنے کی جرأت اور مشاہدے کے بغیر چیزوں کو حقائق کا درجہ دینے سے انکار۔" عربی ذہن میں سائنسی روح اس درجہ بس گئی تھی کہ خدا کی ذات کے سوا ہر چیز کو وہ سائنسی نقطہ نظر سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے توہم کو ٹھکرا کر عقلیت کو جگہ دی اور ہر کام میں نور عقل کو چراغ راہ بنایا ایک الہامی مذہب کے راسخ العقیدہ پیرو کار ہونے کے باوجود عربوں نے جس ذہنی آزادی سے کام لیا اس پر جس قدر حیرت کا اظہار کیا جائے کم ہے اس ضمن میں مشہور مسلم کیمیا داں ابوموسیٰ جابر بن حیان کا ایک قول قابل توجہ ہے "علم کیمیا میں سنی سنائی بات اور بڑے لوگوں کے اقوال کو سند کے

طور پر قبولنے کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی ۔ اس میدان میں قدم رکھنے والوں کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ہر ایسا قول جس کو حق ثابت کرنے کے لئے مشاہدہ صحیح کی حمایت حاصل نہ ہو ، ایک افواہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا ، اپنا اصول تو یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنے قول کی تائید میں تمام ضروری ثبوت پیش کر دے تو ہم بلاتامل کہہ دیتے ہیں ۔ " تمہارا بیان درست ہے " ۔

جوزف ہل لکھتے ہیں یہ بات جابر بن حیان ہی کے متعلق صحیح نہیں بلکہ اس کا اطلاق عام عرب ذہن پر ہوتا ہے عربوں کا ہمہ گیر جذبہ روا داری ، ان کی وسیع النظری ، ان کے دلوں میں علم حاصل کرنے کی لگن اور تحقیق و انکشاف کی سرحدوں تک پہنچنے کا اشتیاق یہ سب باتیں پورے اسلامی کلچر کی ترجمانی کرتی ہیں ۔

دین اسلام علمی تلاش و جستجو کی راہ میں کبھی مزاحم نہیں ہوا ۔ خود پیغمبر اسلامؐ نے اپنے پیروؤں کو مخاطب کرکے فرمایا تھا ۔

" جو کوئی علم کی تلاش میں گھر چھوڑتا ہے جب تک وہ واپس گھر کو پلٹ نہ آئے ، خدا کی راہ میں گامزن ہے " ۔ اور " جو کوئی علم کی خاطر سفر کرتا ہے خدا اس کے لئے جنت کی راہ آسان کر دیتا ہے " ۔

ایک دوسرا مغربی مصنف سیڈلاٹ لکھتا ہے ۔ " مسلمانوں کے مدرسوں میں سائنسی روح کی کارفرمائی ان کا نمایاں ترین پہلو تھا معلوم سے نا معلوم کی طرف بڑھنا ، سماوی مظاہر کا باریک بینی سے مشاہدہ کرنا ، کسی بات کو حق ماننے سے پہلے اس کی تجربی جانچ پڑتال کر لینا ، یہ ہیں وہ چند اصول جن کے عرب علماء سختی سے پابند تھے " ۔

یورپی تہذیب و تمدن پر اظہار خیال کرنے والوں کی رائے میں اسلامی

کلچر مشرق کی بجائے مغرب میں زیادہ بار ور ہوا یورپ کی سرزمین اس پودے کو خوب راس آئی ۔ خصوصاً قرطبہ (۵) کی ہوا ۔ تو علوم کو ترقی دینے اور ان کو بام عروج تک پہنچانے میں خاص مدد گار ثابت ہوئی ۔ قرطبہ مسلمانوں کا دارالحکومت تھا ، تعلیم و تدریس کا یہ حال تھا کہ گھر گھر مدرسے تھے ، لوگ کتابوں کے بے حد شایق تھے ، یہی وجہ تھی کہ بڑی بڑی لائبریریاں وجود میں آئیں ۔ صرف شاہی کتب خانے میں کتابوں کی تعداد چار لاکھ سے متجاوز تھی ۔ امراء نایاب کتابوں کی تلاش اور تازہ تصنیفوں کے حصول میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے ۔ طلیطلہ کے کاغذ سازی کے کارخانے لکھنے پڑھنے کا سامان تیار کرنے میں ملک بھر میں پیش پیش تھے ۔ خوش نویسوں کی بڑی مانگ تھی ۔ دنیا کے گوشے گوشے سے خوشنویس اچھے مشاہروں پر بلائے جاتے تھے جلد سازی کی صنعت کو بھی اس عہد میں بڑی ترقی ہوئی اور اس صنعت نے باقاعدہ کاروبار کی صورت اختیار کرلی ۔ بازنطینی بادشاہ نے عبد الرحمان ثالث کو تحائف بھیجے تو اس میں یونانی مصنف Dioscorides کی مشہور طبی کتاب Pharmacenties کی ایک خوبصورت جلد بھی شامل تھی ۔ بلکہ سب سے قیمتی تحفہ یہی کتاب تھی بادشاہ نے اس نایاب علمی تحفے کے ساتھ اپنے فاضل راہب نکولس کو بھی روانہ کیا ، تاکہ کتاب کے یونانی متن کو عربی میں منتقل کرسکے ۔ کہتے ہیں کہ خلیفہ کے دربار میں نکولس کو جو پیشے کے لحاظ سے ایک کیمیا گر اور دوا ساز تھا وہ عزت اور احترام نصیب ہوا کہ جلد ہی اسے وہ تمام مراعات دے دی گئیں جو کسی بڑے سے بڑے درباری مقرب کو دی جا سکتی ہیں ۔ کیا یہ واقعات ہسپانوی مسلمانوں کی روا داری اور فیاضی کی دلیل نہیں ہیں ؟

یورپ کے مصنف مسلمانوں کی ہر چیز کو شک و شبہ کی نگاہ سے

دیکھنے کے عادی ہیں ۔ خصوصاً مغربی مسلمانوں کے متعلق تو انہوں نے اپنی کتابوں میں اکثر بے سروپا باتیں لکھی ہیں ۔ ان کی معلومات کو ناقص بتایا ہے ان کی اہم تحقیقات کو دنیا کی آنکھوں سے چھپانا چاہا ہے ، اور ان کے عہد آفریں کارناموں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اس سے بڑی احسان فراموشی کی مثال خیال میں نہیں آسکتی ۔ حسد اور کینے کی مثالیں ہمارے دور ہی کی خصوصیت نہیں ہیں قرطبہ کے عہد زریں میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جن کو مسلمانوں کی علمی ترقی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی ۔ قرطبہ کے رومی امیر الور (Alvor) ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ بظاہر راسخ العقیدہ عیسائی نوجوان اپنے کلچر اور مذہبی روایات کو پس پشت ڈال کر عربوں کے شعر، سائنس اور الہیات کے کیوں اتنے گرویدہ ہو گئے ہیں ۔ دراصل اس زمانے میں عربی زبان کی تحصیل نوجوانوں کی تعلیم کا ضروری جز و خیال کی جاتی تھی ۔ جارج سارٹن لکھتا ہے یورپ میں بارھویں صدی عیسوی کے آغاز تک عربی زبان اور عربی علوم کی اعلیٰ تعلیم کے بغیر ایک اچھا ریاضی دان یا ہیئت دان بن جانا نا ممکن خیال کیا جاتا تھا ۔

آئیے اب مغربی مسلمانوں کے علوم کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ انھوں نے موجودہ سائنسی علوم کی ترقی میں کیا حصہ لیا اس جائزے میں سب سے پہلے ہم ریاضیاتی علوم کا ذکر کریں گے ۔ کیونکہ علوم کی یہی شاخ ہے جو تمام سائنسوں میں بنیادی طور پر اہم ہے ۔

اندلس کے مسلمانوں کے ریاضیاتی انکشاف کے متعلق یورپی مصنف جارج سارٹن لکھتا ہے ۔ " جن دنوں آکسفورڈ کی عیسائی یونیورسٹی ابھی اقلیدس کی کتاب اول کے پہلے پانچ مسئلے دہرا رہی تھی ۔ قرطبہ اور طلیطلہ کی مسلم یونیورسٹیوں میں کروی علم المثلث اور نظریہ اعداد پر تفصیلی مباحثے ہو رہے

تھے ۔ سارٹن صاحب کو شاید معلوم ہو گا کہ اقلیدس کے ابتدائی مسئلوں سے واقفیت کا موقع بھی تو مغربی عربوں ہی نے یورپ والوں کو بہم پہنچایا تھا۔

ریاضیاتی علوم میں حسابی اعداد کی قدر و قیمت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ۔ دنیا پر عربوں کا سب سے بڑا احسان انہیں اعداد کی ایجاد اور ان کو رواج دینا ہے اعداد کا ابتدائی تصور ہندیوں کے ہاں پیدا ہوا ، مگر عربوں نے اعداد کو تصور کی دنیا سے نکال کر حقیقت کا جامہ پہنایا اور ان کو زندگی دوام بخشی حسابی رقوم میں اعداد کی مقامی قیمت کا تصور خاص طور پر اہم ہے اس تصور کو عملی صورت دینے کے لئے ایک نئے عدد کی ضرورت تھی ، صفر کی ایجاد نے یہ ضرورت پوری کر دی ۔ صرف صفر کی ایجاد ہی ایسی معرکہ آرا ایجاد ہے کہ علمی دنیا قیامت تک مسلمانوں کے احسان سے سبک دوش نہیں ہو سکتی اعداد کی مقامی قیمت اور صفر کی ایجاد نے کسور اعشاریہ (۷) کی ایجاد کے لئے راستہ ہموار کیا ۔

اعداد پر زیادہ قابل قدر کام مشرق میں ہو چکا تھا ۔ مغرب میں سوائے صفر کو نئی اور بہتر صورت دینے کے ، اعداد پر کوئی خاص اضافہ نہیں کیا گیا یہاں کے مسلمانوں کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ایک تو انھوں نے اس علم کو برقرار رکھا اور دوسرے ، یورپی ممالک میں اس کی ترویج اور اشاعت کا بندوبست کیا ۔ کیننگٹن لکھتا ہے کہ ہسپانیہ کے عرب مقبوضہ میں اعداد کا رواج اور استعمال یورپ کے باقی ممالک کی نسبت کم سے کم تین صدیاں پہلے چل نکلا تھا ۔ بارھویں صدی کے نصف اول میں یورپ کی بندر گاہوں کے تاجر لوگ اپنے حساب کتاب میں عربی اعداد ہی استعمال کرتے تھے ۔ انگلستان میں اس زمانے میں عربی اعداد پر ایک کتاب لکھی گئی جس کی شرح کے طور پر متعدد رسالے لاطینی زبان میں قلم بند کئے گئے اور اس طرح یہ اعداد آہستہ

آہستہ رواج پا گئے ۔

اس عہد کی اکثر کتابوں میں عربی اور رومن اعداد دونوں کا ساتھ ساتھ استعمال ہوا ہے ۔ تیرھویں صدی کے بعض مسودات میں صرف عربی اور بعض میں صرف رومن اعداد نظر آتے ہیں ۔ لیکن آخر کار زمانے نے عربی اعداد ہی کو فوقیت اور قبول عام کا تمغہ دیا ۔ تیرھویں صدی کی دو جدولوں میں جن میں لندن کے پل پر پانی کی زیادہ سے زیادہ بلندی کا ریکارڈ درج ہے عربی علامات استعمال ہوئی ہیں ۔ چودھویں صدی کے ایک ہندسے کے رسالے میں شروع سے لے کر آخر تک عربی اعداد سے کام لیا گیا ہے ۔ ۱۳۸۶ء کے ایک کیلنڈر میں جس میں چاند گرہنوں کی جدولیں درج ہیں اور جو ۴۲ صفحوں پر مشتمل ہے عربی اعداد استعمال ہوئے ہیں ۔ ۱۴۳۰ء کے ایک کیلنڈر میں متعدد اقسام کے اعداد ملتے ہیں ۔ ان میں سولہ اعداد عربی ، آٹھ رومن اور کوئی درجن بھر الفاظ کی شکل میں ہیں اور سب سے نرالی چیز تو وہ عبارت ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک سال شمسی " C C C اور ساٹھ اور پانچ دن اور تقریباً چھ ساعت کے برابر ہوتا ہے (۸) ۔

اندلس کے بڑے ریاضی دانوں میں مسلمہ المجریطی (المتوفی ۱۰۰۷ء) اور القلصدی کا نام لیا جا سکتا ہے المجریطی کے بعض شاگردوں نے ریاضی کی تعلیم کے لئے مدرسے قائم کئے ۔ القلصدی غرناطہ کا باشندہ تھا ۔ جمع ، تفریق ، ضرب میں حاصل جواب کو دیئے ہوئے اعداد کے اوپر لکھتا تھا ۔ اس کی کتابوں میں کئی مفید الجبری علامات ملتی ہیں اور اس اعتبار سے وہ دیگر عرب مصنفوں سے ممتاز ہے ۔ القلصدی نے ۱۴۸۶ء میں وفات پائی ۔

محمد بن موسیٰ نویں صدی کا ایک اور ممتاز ریاضی دان تھا ۔ اسے الجبرا اور علم مثلث میں بڑی مہارت حاصل تھی ۔ جن دنوں وہ اپنے شاگردوں کو

علم مثلث اور دوسرے درجے کی الجبری مساواتوں پر درس دے رہا تھا یورپ میں ابھی کسی نے مساوات کا نام بھی نہ سنا تھا۔

اشبیلیہ کے جابر ابن افلاح (المتوفی ۱۱۴۵ء) نے کر دی علم المثلث میں تحقیقات کی اور طلیطلہ کے ابوالقاسم ساعد بن احمد (۲۹ ۱۰ تا ۱۰۷۰ء) نے سائنسی علوم کی تاریخ پر " طبقات الامم " نامی کتاب لکھی۔

مغرب کا ابن یونس (۱۰۰۰ء) پہلا شخص تھا جس نے گلیلیو سے صدیوں پہلے رقاصہ ساعت سے وقت ماپنے کا کام لیا۔ اس سے پہلے مسلمان دھوپ گھڑی اور پن گھڑی سے کام لیتے تھے۔ گو ان میں بھی انھوں نے اپنی چابک دستی کی بدولت ایسی تدبیریں پیدا کرلی تھیں کہ یہ نہایت ٹھیک وقت دکھاتی تھیں۔

ریاضیات کے علاوہ فلکیات مسلمانوں کا دلپسند مشغلہ تھا۔ ہئیت سے ان کے ذہن کو فطری مناسبت تھی، اور اس کی تکمیل ان کے نزدیک تعلیمی مدارج میں ایک اہم درجہ رکھتی تھی۔ بلکہ عربوں کی سائنس کا مطالعہ کرنے والے خوب جانتے ہیں کہ عرب علمائے سائنس اول ہیئت داں تھے اور بعد ازاں کچھ اور۔ ستاروں کی حرکات کے مطالعہ سے انھیں روحانی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ مشرق میں علم ہیئت کا شوق روز افزوں تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ بغداد اور اس کے نواحی بلاد اسلامیہ میں صدہا رصد گاہیں عالم وجود میں آئیں۔ بلکہ اکثر علماء نے اپنے گھروں پر مشاہدہ فلک کا انتظام کیا تھا مغرب کے علماء نے نہ صرف مشرق کے فلکی انہماک کو برقرار رکھا بلکہ اپنی تحقیقات سے اہل مشرق کی فلکی معلومات میں اضافہ کیا۔ اسپین کے بڑے بڑے شہروں میں عظیم الشان رصدگاہیں قائم کی گئیں۔ اور مسلمان علماء نے یورپ والوں کی توجہ زمین سے ہٹا کر آسمان کی طرف پھیر دی اور ان کے

توہمات کے خداؤں کو ملیامیٹ کرکے انھیں ستاروں سے کھیلنا سکھایا ۔ ڈورسی (Dorsey) نے اہل یورپ کو مخاطب کرکے کیا سچی بات کہی ہے ۔ " تم کہتے ہو نیوٹن کی پیدائش کے لئے کوپرنیکس کا وجود ضروری تھا ۔ لیکن شاید تم نے کبھی غور نہیں کیا کہ کوپرنیکس کی پیدائش کے لئے عربوں کی ہیئت کا وجود اور بھی ضروری تھا " ۔

اندلس کے سربرآوردہ ریاضی داں جابر بن افلاح اور ابوالقاسم ساعد بن احمد ساتھ ہی ساتھ بڑے پائے کہ ہیئت دان بھی تھے ۔ ابن طفیل کے شاگرد ابواسحق نور الدین البترودجی نے سیاروں کے متعلق ایک نظریاتی رسالہ تالیف کیا ، اور اس میں بطلیموس یونانی کی غلطیوں کو آشکار کیا ۔ " اعلان حق (۹) " دراصل مغرب کے الزرقالی اور البترودجی اور مشرق کے البتانی اور نصیر الدین طوسی کے افکار ہیئت کا نتیجہ تھا ۔ کوپرنیکس نے خود البتانی اور الزرقالی کے مرہون احسان ہونے کا اعتراف کیا ہے ۔

ڈریپر عربوں کی ہیئت کے باب میں لکھتا ہے ۔ " عرب نے یورپ پر اپنی ذہنی فوقیت کا جو سکہ بٹھایا ہے عیسائی دنیا اس کا بہت جلد اعتراف کر لے گی آسمان کی اتھاہ وسعتوں میں گردش کرنے والے کروں پر تلاش و جستجو کی خاطر جو پنجے اس نے گاڑے تھے ان کے نشان آج بھی اجرام فلکی کے ناموں کی صورت میں موجودہ ہیئت ہیں دیکھے جا سکتے ہیں " ۔

تمدن یورپ کی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجیئے ۔ ہر جگہ یہی ذکر ملے گا کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا ظہور اٹلی سے ہوا ۔ اور اس طرح یونانیوں کا علمی ذخیرہ لاطینی کے ذریعے مغرب میں اشاعت پذیر ہوا ۔ یہ بیان دراصل یورپی عیسائیوں کے ایک خطرناک احساس کمتری کا پتا دیتا ہے ۔ قرون وسطیٰ کی صلیبی جنگوں نے ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف جو نفرت اور تعصب

کے جذبات بھر دیئے تھے ، ان کا نکاس اور اظہار اس صورت میں ہوا ۔ اسپین کے بجائے اٹلی کو نشاۃ ثانیہ کے ظہور کا اصل مقام بنانا ایسی خود فریبی اور احسان فراموشی ہے کہ اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں ڈھونڈے سے نہیں ملے گی ۔ عیسائی دنیا کے متعصب تاریخ نویسوں کو شاید یہ معلوم نہیں کہ عرب لوگ اسپین میں صرف تلوار لے کر نہیں آئے تھے بلکہ ایک عظیم الشان کلچر اور علمی تحقیق کا شوق اور حوصلہ بھی اپنے ساتھ لائے تھے ، یہ وہ زمانہ تھا جب پورا براعظم یورپ ظلمات کے اندر گم تھا ۔ اور روشنی کی ایک کرن بھی کہیں دکھائی نہ دیتی تھی ۔ عربوں نے اس سرزمین پر قدم رکھا تو گویا علم کا آفتاب ابھر آیا تھا ۔ جس عہد میں اٹلی اور جرمنی کے " اہل تحقیق " بیکار قسم کے مباحثوں اور مناظروں میں مصروف تھے ۔ مثلاً ایک سوئی کے سرے پر کتنے فرشتے ٹھیر سکتے ہیں ۔ اس وقت اندلس میں اسما نامی ایک مسلمان نقشہ سازی زمینی خطوں کی جغرافی خصوصیات اور کسی ملک میں بہ سبب بلندی سلسلہ نباتات اور حیوانات میں وقوع پذیر تغیرات پر تحقیق کر رہا تھا ۔ اور مشہور ہسپانوی عرب جغرافیہ دان الادریسی اور ابوعبید عبد اللہ بن عبدالعزیزالقرطبی (مصنف کتاب المسالک و الممالک) علم جغرافیہ کے ابتدائی اصولوں کی تدوین کر رہے تھے ۔ پھر جس زمانے میں یورپ کے لوگ سوروں کی زندگی گزار رہے تھے ۔ اور مچھروں اور مکھیوں کی طرح لقمہ اجل بن رہے تھے (۱۴) ۔ اندلس کے لوگ ابن سینا کے فلسفے اور طب سے فایدہ اٹھا رہے تھے ۔ یہ اور دوسرے حقایق اتنے واشگاف اور نمایاں ہیں کہ ان سے نظرپوشی کرنا گویا اپنے آپ کو صریح فریب میں مبتلا کرنا ہے ۔ جدید یورپ کے بعض محققوں نے البتہ خدا لگتی باتیں لکھی ہیں ۔ ان میں مسٹر برفالٹ (Briffault) کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے ۔

عربوں کی جغرافیہ دانی ضرب المثل ہے ۔ دنیا کے مختلف حصوں کی سیر و سیاحت ابتدا ہی سے ان کے لئے بے حد باعث کشش تھی ۔ دوسرے ممالک کے لوگوں سے میل ملاپ ، ان کے رسم و رواج اور مذہب کا مطالعہ اور ان کے علوم و فنون سے واقفیت کا شوق عربوں کو اپنے ملک سے دور دور تک لے گیا ۔ گو تجارت اس شوق کا اصل محرک تھی ۔ لیکن تجارتی روابط کے ساتھ یہ لوگ اپنے مشاہدہ صحیح کی عادت کی بدولت بعض قیمتی معلومات بھی حاصل کر لیتے تھے اور ان معلومات کو بعض اوقات درج بھی کر لیتے تھے ۔ ایک طرف انھوں نے چین اور ایشیا کے جنوب مشرقی جزایر سے تعلقات پیدا کئے تو دوسری طرف خدا کی زمین کی سیاحت کا شوق انھیں نئ دنیا میں لے گیا ، اور امریکہ دریافت ہوا ۱۴۹۲ء میں کولمبس کا امریکہ دریافت کرنا بعد کی بات ہے ۔ بعض دور دراز ممالک کے ساتھ اپنے روابط برقرار رکھنے کے لئے عربوں نے بعض آسان سمندری راہیں نکالیں کشتی رانی کا شوق ان میں فطری تھا ۔ ان واقعات کے پیش نظر خیال ہوتا ہے کہ خلافت نے اپنے سواحل کی حفاظت بحری تجارتی کاروانوں کی امداد ، اور دشمن کو ضرب لگانے سے پہلے اس کے ملک کی چہار دیواری میں محصور کر دینے کی تدبیر کے خیال سے اپنی بحری طاقت بھی منظم کی ہو گی ۔ واقع میں ایسا ہی تھا ۔ عرب بحریہ ہر زمانے میں ہر اعتبار سے بے مثال تھا ۔ فان کریمر اس بحریہ کے متعلق رقم طراز ہے " عربوں کا بحریہ عیسائی ممالک میں ہر لحاظ سے مثالی سمجھا جاتا تھا ۔ آج بھی جنوبی یورپ کی زبانوں میں عربوں کی بحری اصطلاحیں اس نمونے کی بحری طاقت کی یاد دلاتی ہیں ۔ آرسنل (لاطینی وارسنل اور عربی دار الاسلحہ) کا روٹ (Corrtte) جو عربی لفظ ۔ اب سے ماخوذ ہے اسی قبیل کے الفاظ ہیں " ۔

نباتیات میں اشبیلیہ کا ابوالعباس خاص ذکر کے قابل ہے ۔ اس نے

بارھویں صدی کے نصف اول میں اسپین شمالی افریقہ ، عربستان اور بحیرہ قلزم کے دوسرے علاقوں کی سیاحت کی اور اپنے مشاہدات و معلومات کو " کتاب الرحلتہ " میں درج کیا ۔ اس کتاب میں اس نے بعض نئی بوٹیوں کے ناموں کی فہرست بھی دی ہے ۔ مشہور قرطبی طبیب ابوجعفر احمد بن محمد (المتوفی ۱۱۶۵ء) نے بعض ہسپانوی اور افریقی پودوں کو عربی اور لاطینی میں خاندان وار نام دیئے اور ان کا اپنی کتاب الادویتہ المفردہ میں ذکر کیا ابن بیطار (المتوفی ۱۲۴۸ء) سب سے بڑا عرب ماہر نباتات خیال کیا جاتا ہے ۔ اس کی تصنیفیں کئی صدیوں تک مرجع خواص رہی ہیں ۔

الجبرا اور بعض دوسرے علوم کی طرح علم کیمیا کی ابتدا بھی اپنی اصل روح کے لحاظ سے عربوں ہی کی ممنون احسان ہے لفظ " کیمیا " مصری الاصل ہے ۔ لیکن یہ لفظ ایک مخصوص علم کے لئے چوتھی صدی عیسوی کے نصف اول سے پہلے مستعمل نہیں ہوا ۔ عرب میں یہ لفظ بالکل علیحدہ معنوں میں مروج تھا ۔ عربوں کے کیمیا سازی کے شغف سے آج کون واقف نہیں ہے ۔ بعد میں جابر بن حیان اور ابن زکریا رازی جیسے کیمیا دانوں کی محنت سے اس علم کو فروغ ہوا ۔ قرطبہ اشبیلیہ ، طلیطلہ اور غرناطہ کی جلیل القدر یونیورسٹیوں میں کیمیا کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی ۔ یورپی مصنفوں نے جو دھول ہمارے علوم پر اڑائی ہے اس کی وجہ سے تاریخ کی آنکھ ابھی تک شاید کسی ایسے شخص کو نہیں پہچان سکی جس نے اندلس میں کیمیائی انکشافات اور ذاتی تحقیقات کی بدولت نام پیدا کیا ہو ۔

علم کیمیا کو طب سے بڑا گہرا تعلق ہے ۔ دوا سازی میں کیمیائی اصولوں کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے ۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ابوالقاسم (۹۱۲ تا ۱۰۱۳ء) قرطبہ کا بہترین طبیب تھا جسے کیمیائی نظریوں اور تجربی اصولوں سے پوری

واقفیت تھی ۔ ابوالقاسم نے علم جراحی میں بھی بعض دریافتیں کیں ۔ اس نے اس علم میں جو تصنیفیں چھوڑی ہیں ان میں تشریح بدن کے تحت مختلف اعضاء کے وظائف کو اشکال کے ذریعے واضح کیا ہے ، ناقص ، بے قاعدہ اور ہلنے والے دانتوں کو عمل جراحی سے درست کرنے کی ہدایات تحریر کی ہیں ۔ اور ماں کے رحم میں جنین کی مختلف ارتقائی صورتوں کی وضاحت کی ہے اور ان مدارج کی اشکال بھی ساتھ درج کی ہیں ۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے کا طریقہ بھی اسے معلوم تھا ۔ ابوالقاسم نے پرانی وضع کی بے ڈھب پچکاری کی جگہ ایک نئی پچکاری ایجاد کی ایک جگہ اس نے اپنے ہم پیشہ لوگوں کو مخاطب کرکے لکھا ہے " جیسے کہ میں کئی بار تمہیں تنبیہہ کر چکا ہوں ، اپنے پیشہ ورانہ کام میں انتہائی احتیاط سے کام لو ۔ اس طرح تمہاری حکمت سے انشاءاللہ خدا بھی خوش ہو گا اور بندے بھی " ۔

مشرق کے ابن زکریا رازی کے بعد ابوالقاسم کو حکمت اور طب کے میدان میں دوسرا درجہ دیا جاتا ہے ۔ ابوالقاسم نے اپنی شہ کار تصنیف " التاثیر (؟) میں چند دلچسپ واقعات کا ذکر کیا ہے ۔ مثلاً وہ پھوڑا جس نے ابوالقاسم کی طالب علمی کے زمانے میں اس کے والد کو ہلاک کر دیا تھا ۔ ایک دوسرا پھوڑا جو خود ابوالقاسم کے بدن پر نکل آیا تھا اور کھانسنے سے گندا مواد خارج ہو جانے پر اس کی جان بچ گئی تھی ۔ کان کے اندرونی پردے کی سوزش اور ورم ، معدے کے سرطان اور فتق کے علاج کا ذکر بھی اسی ضمن میں آیا ہے ۔

حلق کے فالج کا علاج اس نے یہ تجویز کیا ہے کہ مریض کے معدے میں ٹیوب سے دودھ ڈالا جائے ۔ اس نے اس قسم کا تجربہ ایک بکری پر کیا ۔ انتڑیوں کے دق کا بھی اسی نے سراغ لگایا اور قدیم اطبا کی طرح اس کے لئے دودھ تجویز کیا ۔

اشبیلیہ کا ابن زبیر (Avemzoar) المتوفی ۱۱۶۲ء بارھویں میں صدی میں وہاں کے ایک ہسپتال کا سپرنٹنڈنٹ تھا وہ ابوالقاسم کے بعد سب سے بڑا عرب طبیب اور جراح مانا جاتا ہے ۔ ابن زبیر نے بھی علم تشریح بدن میں نئے انکشاف کئے ۔ اس نے علم طب پر اپنی عظیم تصنیف کو اپنے دوست اور شاگرد ابن رشد کے نام معنون کیا ۔ ابن رشد ایک طبیب کی بہ نسبت ایک فلسفی اور ارسطو کے شارح کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوا ۔ البتہ طب میں ابن رشد نے ایک تصنیف ضرور چھوڑی ہے ۔

مشہور ہسپانوی یہودی طبیب ابوموسیٰ (بن میمون ؟) بھی اپنے زمانے میں بہت برا ماہر طب تھا ۔ لیکن اسے زیادہ عرصے اسپین میں رہنا نصیب نہ ہوا اس نے خوف خلق سے بھاگ کر قاہرہ میں سلطان صلاح الدین کے پاس ۔ ۔ ۔ پناہ لی ۔ اور سلطان کے اشارے پر اپنی شہرہ آفاق طبی کتاب تالیف کی ۔ دیباچہ سلطان کو مخاطب کرکے لکھا ہے اور کتاب کے چار حصوں میں علیحدہ علیحدہ مطالب کی تشریح کی ہے ۔ مثلاً حصہ اول اصول طب کے متعلق ہے حصہ دوم میں ان مریضوں کے لئے ہدایات ہیں جنھیں طبی امداد آسانی سے میسر نہیں آسکتی ۔ حصہ سوم خود سلطان کے بیمار پڑ جانے کی صورت میں مختلف طریقہ ہائے علاج کے بارے میں ہے ۔ اور حصہ چہارم عام مریضوں اور امراض سے بحث کرتا ہے ۔ اس کتاب کے علاوہ ابی موسیٰ نے بقراط کی عظیم طبی تصنیف پر حاشیہ لکھا ۔ جالینوس کی تصنیفات کا خلاصہ تیار کیا ، اور مشہور حکماء کے طب سے متعلق مقولے جمع کئے ۔ دمہ ، زہر اور غذائیات پر رسالے لکھے ، اور بو علی سینا کی ایک کتاب کا ترجمہ کیا (۱۱)

فن طب کے اس مختصر ذکر کے ساتھ آیئے اس عظیم الشان ہسپتال کا بھی جائزہ لیتے ہیں جس کی عمارت تیرھویں صدی عیسوی کے آخری ربع میں

مکمل ہوئی ۔ ۱۲۸۵ء میں سلطان منصور نے اس کی تعمیر اپنی نگرانی میں شروع کرائی اور اس کے بعد اس کے بیٹے ناصر نے ۱۲۹۳ء میں اسے تکمیل تک پہنچایا ۔ وسعت اور علاج کی سہولتوں کے لحاظ سے اس ہسپتال کی مثال قرون وسطیٰ میں مشکل سے ملے گی ۔ ہسپتال کے اندرونی چہار پہلو ستونوں والے صحن کے گرداگرد چار وسیع کمرے صلیب نما صورت میں ترتیب دیئے گئے تھے ۔ جن میں سے ایک کمرہ ہسپتال کے عملے کے لئے مخصوص تھا اور باقی تین مریضوں کے لئے افسوس ہے کہ آج اس عظیم الشان ہسپتال کے اندرون کے بس چند نشان زمانے کی دست برد سے بچ سکے ہیں ۔ ان میں تہ دار پٹوں والے دروازے بھی شامل ہیں ۔ جنھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں مریضوں کی تفریح اور ان کے آرام کا کتنا خیال رکھا جاتا تھا ۔ بادشاہوں کے محلوں کی طرح یہاں بھی چھوٹی چھوٹی نہروں کا ایک جال بچھا ہوا تھا جن میں ہلکا تموج اور لہروں کی میٹھی شور انگیزی موسیقی کا لطف دیتی تھی ۔ صبح کی اذان اصل وقت سے دو گھنٹے پیشتر بلند کی جاتی تاکہ نیند کی نعمت سے محروم مریضوں کو رات کے طویل ہونے کا احساس نہ ہونے پائے اور وہ گمان کریں کہ بس اب صبح پھوٹنے ہی والی ہے ۔ غرضکہ ہر اس چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات کا خیال رکھا جاتا تھا جس سے مریضوں کی خاطر خواہ دیکھ بھال میں مدد مل سکے اور ہر وہ احتیاط برتی جاتی تھی جو اس زمانے میں طبی طور پر ممکن تھی ۔ مختلف بیماریوں کے علاج کے لئے مخصوص وارڈ تھے ۔ مخبوط الحواس اشخاص کے لئے جو حصہ وقف تھا ، اس میں زندگی کو پر آسائش بنانے کے لئے ہر امکانی تدبیر کر لی گئی تھی ۔ بیماروں کی رہائش کا انتظام ہسپتال کے شمالی اور جنوبی حصوں میں موجود تھا ۔ یہ حصے مصنوعی تدبیروں سے سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں سرد رکھے جاتے تھے ۔ کمروں میں تازہ ہوا کی آمد و رفت پر زور دیا جاتا تھا ۔

ہسپتال والوں کا مقولہ تھا " آدمی کھانا دن میں ایک دوبار ہی کھاتا ہے لیکن ہوا کی تازہ غذا اسے ہر لمحے درکار ہوتی ہے ۔"

اندلس میں علوم سائنس کی ترویج اور ترقی کا یہ ایک نہایت مختصر جائزہ ہے ۔ ممکن ہے بعض اہم نام رہ گئے ہوں اور بعض اہم علمی انکشافات کا بیان بھی نہ ہوا ہو لیکن ہمارے خیال میں اس سے زیادہ موجودہ مضمون میں گنجائش بھی نہ تھی اس مضمون کی تیاری میں زیادہ تر یورپین اور امریکن مصنفین کی کتابوں سے مدد لی گئی ہے ۔ ایک دو کتابیں ایسی تھیں جن کا براہ راست جرمن سے انگریزی یا اردو میں ترجمہ ہوا ہے ۔ ناظرین میں سے اگر کوئی صاحب ذوق مزید مطالعہ کرنا چاہیں تو اردو میں تمدن عرب ، مسلمانان اندلس وغیرہ اور یورپ زبانوں میں فرنچ اور جرمن زبان کی متعلقہ تصنیفوں کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے ۔ اصل عربی تصنیفیں بھی اس باب میں غیر معمولی طور پر مفید ہو سکتی ہیں ۔ یہ کتابیں فی الحال راقم کی پہنچ سے باہر تھیں ۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یورپ اور انگلستان کے ان بڑے بڑے عیسائی اور یہودی علماء کا بھی تذکرہ لکھ دیا جائے جنہوں نے عربوں کے علوم عرب فضلا کے سامنے بیٹھ کر سیکھے اور پھر تراجم کے ذریعے ان علمی ذخیروں کو یورپ کی سرحدوں تک پھیلاتے چلے گئے ۔ ان علوم کی اشاعت میں محض چند افراد ہی نے حصہ نہیں لیا ، بلکہ پوری قوموں اور حکومتوں نے روپیہ پانی کی طرح بہا کر عربوں کی پوری حکمت کو سمیٹ لیا ، ۔ ۔ ۔ ۔ اور بیش بہا میراث کے وارث نہیں بلکہ مالک بن بیٹھے ۔ اور درمیان سے عربوں کا نام ہی اڑا دینے کے منصوبے باندھنے لگے ۔

کیسٹائل کے عیسائی بادشاہ نے تو فرمان جاری کر رکھا تھا کہ کسی گھر میں کوئی کتاب طاق میں ایسی نہ پڑی رہے جسے گھر والے مطالعہ نہ کر چکے

ہوں ۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی جرات آموزیوں کے بعد عیسائی ممالک کے باشندوں نے اسلامی علوم سیکھنے میں کیا کسر اٹھا رکھی ہو گی !

اٹلی کا فریڈرک دوم خود تو مترجم تھا ہی ، اس نے بعض دوسرے چوٹی کے علماء سے بھی اپنی نگرانی میں ترجمے کا کام لیا ۔ لیو نارڈ و اور مائیکل اسکاٹ (۱۲۳۰ء) ان علماء میں غالباً سب سے زیادہ مشہور ہیں ۔ لیونارڈ و نے اپنی مشہور زماں کتاب " Liber Abaci " کا ترمیم شدہ ایڈیشن مؤخرالذکر کے نام معنون کیا ۔ اس کتاب نے براعظم یورپ میں عربی اعداد پھیلانے میں بہت کام کیا ۔

سلر نو کی اطالوی یونیورسٹی میں بہت جلد عربی کے لاطینی تراجم پڑھائے جانے لگے اور آہستہ آہستہ یہ علوم یہودی اطباء کے ذریعے شمالی یورپ میں پھیل گئے ۔ مانٹ کیسینو کا راہب کانسٹینو بھی سلر نو سے کچھ عرصے متعلق رہا یہاں وہ عربی طب کی تعلیم دیتا تھا ۔

جس طرح قرون وسطیٰ میں نام کے ساتھ " جراح اور حجام " کے الفاظ مروج تھے ، عیسائی علماء نے مسلمانوں کی دیکھا دیکھی نام کے ساتھ قابلیت کی علامت کے طور پر " طبیب اور جبر دان " لکھنا شروع کر دیا ۔ یہ رسم زمانہ حال تک اسپین اور اس کے نواحی علاقوں میں موجود تھی ۔

یورپ کے باشندوں اور اندلوسی مسلمانوں کے درمیان جو خلیج حائل تھی اس کو پاٹنے کے لئے طلیطلہ کے بڑے پادری نے ایک دارالترجمہ قائم کیا تاکہ عربی علوم کو لاطینی میں ڈھالا جا سکے ۔ اس ادارے کا مربی ایک مقامی امیر تھا ۔ مشہور یہودی مصنف یوحنا بن داؤد اس ادارے میں مدد گار تھا ۔ یہ لوگ بیس برس کی محنت شاقہ کے بعد تمام عربی فلسفے کو لاطینی میں منتقل کرنے میں کامیاب ہوئے ۔

مس یلڈھم نے اپنی کتاب میں ان علماء کی ایک فہرست دی ہے جنھوں نے اسپین میں آکر عربی علوم (خصوصاً ریاضیاتی علوم) حاصل کئے اور ان کی اشاعت میں حصہ لیا ۔ اس فہرست میں اکثریت انگریز عالموں کی ہے اس فہرست میں سب سے پہلا نام والکر (۱۰۹۰ء) کا ہے ۔ اس شخص نے کچھ وقت یورین میں گزارا ۔ وہ " شمار و تعدد " کا بہت بڑا ماہر تھا ۔ اور سب سے بڑا انگریز تھا جس نے مسلمانوں کے علوم سیکھنے کی طرف توجہ کی ۔

(۲) ایڈل ہارڈ آف باتھ (۱۱۳۰ء) نے علم حساب پر عربی تصنیفوں اور اقلیدس کی مبادیات اور ہیئت کا ترجمہ کیا اور " Abacus " پر ایک رسالہ لکھا ۔ یہ شخص کوئی سات برس تک شام اور بحیرہ روم کے دیگر ممالک میں " آوارہ گردی " کرتا رہا ۔ اور آخر کار اس نے اسپین میں پہنچ کر قرطبہ کے ریاضیاتی لیکچروں میں شرکت کی ۔ مغربی یورپ میں اقلیدس کے مبادیات ہندسہ اور ہندی اعداد کا علم پھیلانے کا سہرا اسی کے سر ہے ۔

(۳) ولیم شیلے (۱۱۴۰ء) بھی عربوں کے علوم سے بہت متاثر ہوا اور بالآخر عربی اعداد کو انگلستان میں رواج دینے میں کامیاب ہوا ۔

(۴) ۔ رابرٹ آف چیسٹر (۱۱۴۳ء) نے الخوارزمی کی کتاب الجبرو المقابلہ کا لاطینی میں ترجمہ کیا اور غالباً اس نے الخوارزمی کی کتاب حساب کا بھی ترجمہ کیا رابرٹ کا نام علمی دنیا میں قابل صد احترام ہے ، کیونکہ اس نے نہ صرف دنیا کی اولین کتاب الجبرا کا ترجمہ کیا بلکہ سب سے زیادہ مستند عربی کتاب کیمیا کا بھی ترجمہ کیا ۔ اور اس طرح یورپ پہلی دفعہ علم کیمیا سے روشناس ہوا ۔ یہ ترجمہ ۱۱ فروری ۱۱۴۴ء کو مکمل ہوا تھا ۔

(۵) ۔ راجر آف ہیرَ فورڈ (۱۱۷۶ء) علم حساب کا ماہر مشہور نہیں ہوا لیکن کیلنڈر کی ترتیب و تحقیق کے ساتھ اس کا شغف ظاہر کرتا ہے کہ وہ اس علم

میں بڑی دسترس رکھتا تھا ۔ اس کی مرتب کی ہوئی جدولیں عربی اعداد میں دکھائی گئی ہیں ۔

(٦) دانیال مارلے (۱۱۹۰ء) آکسفورڈ اور پیرس میں تعلیم حاصل کرکے تکمیل کی خاطر طلیطلہ میں آیا ۔ طلیطلہ اس زمانے میں عربی فلسفے کا بہت بڑا مرکز تھا ۔ مارلے نے بعض کتابوں کا ترجمہ بھی کیا ۔

(۷) ۔ جان ہالی وڈ (۱۲۵۶ء) نے عربی حساب اور کرے کے علم پر رسالے لکھے ۔ یہ رسالے صدیوں تک علماء کی توجہ کا مرکز بنے رہے ۔

(۸) راجر بیکن (۱۲۱۴ تا ۱۲۹۲ء) بھی جابر بن حیان (۱۲) اور ابن الہشیم کے ساتھ برابر کا مظلوم ہے ۔ عرب علماء کے آسمان شہرت سے تو زمانے نے بعض روشن ستارے توڑ لینے چاہے لیکن راجر بیکن کے ساتھ جو ظلم ہوا اس کی نوعیت غیر سلبی تھی ۔ یعنی اس کے آسمان عظمت میں مصنوعی اور ناموزوں ستاروں کے جھرمٹ ٹانک دیئے گئے یورپ والوں کی انتہائی بے جا خوش گمانی نے خدا جانے اس کی انصاف پسند روح کو کتنی اذیت پہنچائی ہو گی ۔ حالاں کہ اس نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ میرے خیالات اصل اور ذاتی ہیں بلکہ اس نے ہمیشہ عربوں کے احسان کا اعتراف کیا ۔

منطق استقرائی کے اصولوں کو راجر بیکن کی ایجاد کہنے والے ایک افسوس ناک احساس کمتری کا اظہار کرتے ہیں جو بری طرح ان کے دلوں اور دماغوں پر مسلط ہو چکا ہے ۔ اس مرض مہلک سے معلوم نہیں یورپ کو کب نجات ملے گی ؟

راجر بیکن نے جو تصنیفیں چھوڑی ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ وہ عربوں کے حساب اور علم ہیئت سے خوب واقف تھا اس نے مطالعہ اعداد اور حسابی علموں کی ایک فہرست مرتب کی جس میں جمع ، تفریق ، اوسط ، ضرب ، تقسیم

اور صحیح و مکسور اعداد کا جذر نکالنے کے طریقے شامل ہیں (۱۳) ۔

ان علماء کے علاوہ بعض دوسرے یورپی علماء نے بھی ترجمے کے کام میں بے حد محنت کی ۔ ان میں جیراڈ آف کریمونا نے طلیطلہ میں تعلیم پائی اور ایک روایت کے مطابق کوئی نوے عربی کتابوں کا ترجمہ کیا ۔ اس مجموعے میں بطلیموس کی " المجسطی " کا عربی ایڈیشن بھی شامل تھا ۔ جیراڈ کے عظیم کارنامے کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اہل یورپ کے لئے وہی کام کیا جو حنین ابن اسحٰق نے اہل عرب کے لئے کیا تھا ۔ مشہور بدعتی پادری پسنلو نے ہندی حساب داں بھاسکر کے عربی حساب کا ترجمہ کیا ۔ رچرڈ برٹن نے بھی بعض قیمتی ریاضیاتی کتابوں کو اپنی زبان میں منتقل کیا ۔

جہاں تک سائنسی علوم کا تعلق ہے عصر حاضر کی تہذیب عربوں کی زیر بار احسان ہے ۔ اس میں شبہہ کرنا گویا تاریخ کو جھٹلانا ہے بعض یورپی محققین کا تو یہاں تک خیال ہے کہ نہ صرف سائنسی علوم مثلاً کیمیا اور الجبرا کے بنیادی اصول عربوں کے ذہنی تفوق کا پتا دیتے ہیں بلکہ جدید یورپ کے فن شعر میں بھی بحر اور قافئے کی حد تک اندلوسی عربوں کا اثر جھلکتا دکھائی دیتا ہے لیکن ایک بات جس کا یہاں ذکر کر دینا غالباً نامناسب نہ ہو گا یہ ہے کہ عیسائیوں نے عربوں کے علوم سائنس کی طرف جتنی توجہ کی اس کا عشر عشیر بھی عربوں کے آرٹ کو نہ ملا یہی وجہ ہے کہ سائنسی علوم کی استوار بنیادوں پر تو یورپ نے انکشافات اور ایجادات کے محل تعمیر کر دیئے مگر عربی آرٹ وہاں کا وہیں رہ گیا ۔

عربی آرٹ میں عربوں کا فن تعمیر خاص طور پر قابل ذکر ہے ۔ اندلوسی مسلمانوں کے فن تعمیر کی معراج قصر الحمرا میں واقع ہوئی ۔ ایک مغربی مصنف کی زبان سے اس عظیم الشان رومانی محل کی تعریف سنئے :

"مدھم روشنی میں ہلکے اور لطیف رنگوں کا حسین امتزاج دیکھنے والوں کو اچانک یہ یاد دلاتا ہے کہ وہ چاروں طرف سے سخت اور مضبوط دیواروں میں گھرا ہوا ہے۔ دیواروں پر بعض قرآنی آیات کی بار بار تکرار اور دیگر حیرت انگیز ہندسی اور خطاطی کے نقش و نگار کو دیکھ کر انسان یہاں آپے میں نہیں رہ سکتا بلکہ ماحول میں جذب ہو کر رہ جاتا ہے۔"

ہمارے ماضی کے یہی وہ نقوش اور آثار ہیں جن کو زمانے کے ہاتھوں کس مپرسی کی حالت میں دیکھ کر ہمارے عظیم شاعر اقبال نے خون کے آنسو بہائے تھے:

ہے زمین قرطبہ بھی دیدہ مسلم کا نور
ظلمت مغرب میں جو روشن تھی مثل شمع طور
بجھ کے بزم ملت بیضا پریشاں کر گئی
اور دیا تہذیب حاضر کا فروزاں کر گئی
قبر اس تہذیب کی یہ سرزمین پاک ہے
جس سے تاک گلشن یورپ کی رگ نمناک ہے

فٹ نوٹ:

(۱) ۔ تاریخ فلسفہ اسلام ترجمہ ڈاکٹر عابد حسین ۱۹۹ ۔ ۲۰۰

(۲) ۔ اس مضمون میں مغرب کا لفظ شمال مغربی افریقہ اور یورپ میں اسلامی مقبوضوں کے لئے استعمال ہوا ہے خصوصاً ہسپانیہ ، صقلیہ اور مراکش کے لئے ۔

(۳) ۔ مشرق سے بغداد اور اس کے ملحقہ معروف بلاد اسلامیہ مراد لینے چاہئیں ۔

(۴) ۔ ترجمہ انگریزی جناب خدا بخش صاحب ایم ۔ اے

(۵) ۔

ہوائے قرطبہ شاید یہ ہے اثر تیرا
مری نوا میں ہے سوز و سرور عہد شباب
(اقبال)

(۶) ۔ موجد محمد بن موسیٰ

(۷) موجد النساوی

(۸) ۔ The story of Reckoning in the Middle Ages by Miss yeldham p 85.86.

(۹) ۔ کوپرنیکس کی انقلابی تصنیف جس میں اس نے بتایا ہے کہ زمین کائنات کا مرکز نہیں بلکہ ایک لحاظ سے سورج ہے جس کے گرداگرد خود زمین سال میں ایک بار گھوم

جاتی ہے اور یہ کہ ستارے سورج کے گرد گھومنے میں مدور راستے بناتے ہیں اس آخری خیال کی کمپلر نے تصحیح کی ہے۔

(۱۰) - Groatmen of Science by Grore Milson N.york 1929.

(۱۱) - History of Medicine by Dr.Walter Libby.

(۱۲) - عرب سائنس کی تاریخ میں جن دو عالموں پر سب سے زیادہ کیچڑ اچھالی گئی ہے وہ جابر بن حیان اور ابن الہیثم ہیں - اول الذکر سب سے بڑا ماہر کیمیا تھا اور مؤخرالذکر عظیم ماہر طبیعیات - بعض یورپی لکھنے والوں نے دونوں کی ہستی ہی سے انکار کر دیا ہے جابر غالباً اس لحاظ سے زیادہ مظلوم ہے کہ کوئی اسے یونانی بتاتا ہے کوئی شامی عیسائی اور کوئی یہودی - دوسرے مصنف جو ان عالموں کی ہستی کا اقرار کرتے ہیں جب ان کے کارناموں کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی قدر و قیمت کا شرمناک طور پر حقیر انداز پیش کرتے ہیں - بہت تھوڑے مصنف ایسے ہیں جو تعصب کا شکار نہیں ہوئے اور جنھوں نے اصل واقعات کو من و عن بیان کیا ہے - ابن الہیثم کا ہم نے اپنے مضمون میں جان بوجھ کر ذکر نہیں کیا مصنفوں کے نزدیک وہ مصری الاصل تھا دوسرے اسے بصرہ کا باشندہ بتاتے ہیں - ہماری معلومات کے مطابق اس کا تعلق مشرق ہی سے تھا -

(۱۳) - The Story of Reckoning in the Middle Ages

مکاتیب اقبال میں بعض اہم کتابوں کا ذکر

" میری محسن کتابیں " کے عنوان سے ہمارے زمانے کے بعض اہل علم نے اپنی تحصیل و اکتساب سے متعلق بعض نہایت کار آمد اور دلچسپ باتیں قلم بند کی ہیں ۔ اس سلسلے میں غالباً تازہ ترین مضمون جناب مالک رام صاحب کا ہے جو " میری پسند کی اردو کتابیں " کے عنوان سے " آج کل " بابت فروری ۵۱ء میں شائع ہوا تھا ۔ یہ مضمون اور اس قسم کے دوسرے مضامین اس اعتبار سے بڑے اہم ہیں کہ یہ ایک طرف اپنے مصنفوں کے ذاتی رجحانات ، ان کے علمی کمالات اور ان کی عام دلچسپیوں کا پتا دیتے ہیں تو دوسری طرف قارئین کو مزید مطالعے کا شوق اور علمی تحقیق و جستجو کا حوصلہ عطا کرتے ہیں پھر قارئین کو سب سے بڑا فائدہ ان سنجیدہ رایوں سے پہنچتا ہے جو بعض کتابوں کے متعلق ان مضامین میں درج ہوتی ہیں ۔

ہماری رائے میں ایسے مضامین کو خاص اہمیت دینی چاہیے ۔ اور اپنے ملک کے دیگر سربرآوردہ اہل علم سے بھی اس طرح کے مضامین لکھوانے چاہئیں ۔ اس تحریک کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ ہمارے نوجوان طبقے میں مذاق سلیم کو ترقی ہو گی اور ان کے ذہن معیاری اور عظیم علمی و ادبی کارناموں کی طرف متوجہ ہوں گے ۔ ظاہر ہے کہ اگر نوجوان طبقہ علمی و ادبی اعتبار سے سنبھل جائے اور اس میں صحیح قسم کا ذوق پیدا ہو جائے تو ملک کی اس سے بڑی اور کیا خوش قسمتی ہو گی ۔

علامہ اقبال مرحوم کی شخصیت اور ان کے کلام نے عہد حاضر کے ہندی و پاکستانی مسلمانوں کا ذہنی خمیر اٹھانے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے بلکہ اگر یہ کہا

جائے کہ آج کل کے عام مسلم تعلیم یافتہ نوجوان کے ذہن کا مطالعہ کرنے سے پہلے اس کے پس منظر کے طور پر علامہ مرحوم کی زبردست شخصیت اور ان کے حوصلہ بخش کلام کا گہری نظر سے مطالعہ کر لینا چاہیئے تو کوئی مبالغہ نہ ہو گا مولانا شبلی مرحوم غالباً پہلے زبردست مسلمان مصنف تھے جنھوں نے اپنی تاریخ و فلسفہ و کلام سے ہندوستانی برطانوی عہد میں اٹھنے والے اولین فتنوں کا تدارک کیا تھا اور عیسائی مشنریوں کی طوفانی تبلیغ کے آگے اسلام کے حق میں مضبوط دلائل و براہین کا بند باندھ دیا تھا ابوالکلام آزاد بعد میں آتے ہیں مگر ہمارے خیال میں " مرحوم " ابوالکلام کا کارنامہ شبلی مرحوم سے زیادہ وقیع ہے شبلی اسلامی کلچر کے نمایندہ تھے ۔ ان کی ساری عمر اسلامی کلچر کے مطالعے اور بھولے بھٹکے اور مرعوب مسلمانوں کو اس کلچر کا دلدادہ بنانے میں گزری ، لیکن عہد رفتہ کے ابوالکلام نے مسلمانوں کے لئے ایمانی و ایقانی مہم جاری کی تھی وہ اپنے عہد شباب میں اسلامی قرن اول پر فریفتہ نظر آتے ہیں اور بے تاب ہیں کہ مسلمان پھر سے قرآن کی طرف لوٹ آئیں ۔

علامہ اقبال مرحوم ابوالکلام کا پرتو نہیں ہیں لیکن دونوں کی آواز میں بہت کچھ یکسانی ہے ۔ مافی الضمیر دونوں کا ایک ہے مرحوم ابوالکلام کی مدلل تقریر اور مرحوم اقبال کا پرسوز شعر تاثیر کے اعتبار سے اگر ایک دوسرے کی جگہ نہیں لے سکتے تو آمنے سامنے ضرور رکھے جا سکتے ہیں البتہ ایک بات جو دل میں کھٹکتی ہے ، یہ ہے کہ ابوالکلام کو زمانے نے مہلت نہ دی اور وہ بہت جلد " مرحوم " ہو گئے ۔ علامہ اقبال آخر دم تک زندہ رہے اور لوگوں کے دلوں کو اپنی جان پرسوز سے گرماتے رہے ۔ ان کے شرار زندگی نے دلوں کے خرمن میں جو آگ لگائی تھی ، وہ بس اب بھڑکنے کو ہے اور قریب ہے کہ سارا عالم اس کے نور سے منور ہو جائے ۔

ہندی مسلمانوں کے ماضی قریب کی تاریخ میں یہی دو روشنی کے مینار نظر آتے ہیں ۔ ان روشنی کے میناروں سے ان گنت لوگوں نے اکتساب نور کیا ہے ۔ اب ذہن میں ایک دلچسپ سوال اٹھتا ہے کہ یہ روشنی کے مینار اس تاریکی کے زمانے میں کیونکر وجود میں آگئے ۔ اس سوال کا جواب دینے کے لئے طویل وبسیط مضامین لکھے جا سکتے ہیں ، وقت کی ضرورت کا سہارا لیا جا سکتا ہے اور ہندی مسلمانوں کی پوری تاریخ کو پس منظر کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اور شاید اس ضمن میں ان شخصیتوں کی تعلیم و تربیت ان کی ذہنی ساخت اور ان کے مشاغل کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے ۔ اس آخری پہلو کو اجاگر کرنے کے لئے اساتذہ اور مربیوں کے تذکرے کے علاوہ ان کتابوں کا بیان بھی یقیناً ضروری ہے جو ان کی طبائع پر زیادہ سے زیادہ اثر انداز ہوئیں ۔ ابوالکلام ہم سے دور ہیں اس لئے ان کی محبوب کتابوں کا سراغ لگانا یقیناً مشکل ہے ۔ آئیے حضرت علامہ اقبال کی پسندیدہ کتابوں کے متعلق ضروری معلومات حاصل کریں ۔

علامہ اقبال مرحوم بہت بڑے ہمہ داں تھے ۔ ان کی ابتدائی زندگی مغربی فلسفے کی تحصیل و تحقیق میں گزری تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اس کا مقابلہ اسلامی تعلیمات سے بھی کیا اور اپنی پختگی عمر کا زیادہ حصہ اسلام اور اسلامی فقہ و سیاست ، تہذیب و تمدن اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا اس مسلسل اور متواتر تعلق کی بدولت انہوں نے ایک خاص بصیرت پیدا کر لی تھی اور وہ خوب جانتے تھے کہ ایک عالمگیر حقیقت کے اعتبار سے اسلام کی حیثیت کیا ہے ۔ وہ عمر بھر اس خاص بصیرت کو عام کرنے کی کوشش کرتے رہے خدا سے آخر دم تک ان کی آرزو رہی :

مرا نور بصیرت عام کر دے

ان کی توجہ کا بڑا مرکز مسلمان نوجوان طبقہ تھا ۔ ضرورت ہے کہ اقبال کا پیغام عام کرنے کے لئے نوجوانوں کی توجہ ان مخصوص کتابوں کی طرف مبذول کرائی جائے جو کلام اقبال کے سمجھنے کے لئے پس منظر کا کام دیتی ہیں ۔

علامہ اقبال کی زندگی میں ان کی محبوب کتابوں کے بارے میں کوئی ان سے سوال کرتا تو علامہ کا جواب ہمارے لئے یقیناً مفید اور دلچسپ ہوتا غالباً ان کے پاس بیٹھنے والے بھی جو ان کے مذاق اور مزاج کو سمجھتے تھے اس سوال کا مناسب اور معقول جواب دے سکیں ۔ لیکن آج ہمارے لئے مطلوبہ جواب تلاش کرنے میں سب سے معتبر ماخذ علامہ کی تصانیف نظم و نثر کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ۔ لہذا ہم اسی ماخذ پر بھروسا کرکے اپنا بیان شروع کرتے ہیں ممکن ہے ہم بعض ایسی کتابوں کا نام نہ لے سکیں جو علامہ کو بہت عزیز تھیں ۔ اس کے لئے ہماری یہ معذرت کافی ہو گی کہ ان کے نام ہمارے ماخذ میں نہیں ملے یہاں ایک اہم بات کی طرف اشارہ کر دینا یقیناً مفید ہو گا کہ علامہ کتابوں کو ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کا ذریعہ خیال کرتے تھے ان کے ہاں کتابیں خبر پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں لیکن اگر خبر نظر پیدا کرنے میں معاون اور مدد گار ثابت نہیں ہوتی تو خبر بیکار ہے اور اس کی ذمہ دار کتابیں بیکار محض ۔

مشفق محترم جناب ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ صاحب نے اپنے ایک مقالے میں بتایا ہے کہ دیوان فیضی علامہ کے دائمی مطالعے میں رہتا تھا دوسرے حدیقہ سنائی اور دیوان حافظ کو بھی اکثر دیکھتے تھے یہی تین کتابیں مثلاً ایسی ہیں کہ اگر جناب ڈاکٹر صاحب موصوف ان کا ذکر نہ کرتے تو ہم بے خبر رہتے کیونکہ ان کتابوں کا نام تصانیف اقبال میں کہیں نہیں آیا البتہ بعض جگہ اشارے ضرور موجود ہیں ۔

اقبال کی نظم کی کتابوں میں بہت کم کتابوں کا ذکر ہوا ہے ایک مقام

پر " مکالمات فلاطون " کا نام آیا ہے ۔ ایک جگہ صاحب تفسیر " کشاف " کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ ابوالعلامعری والی نظم میں " غفران و لزومات " کے نام ملتے ہیں ۔ بعض دوسری کتابیں جن کی طرف بعض مقامات پر اشارہ موجود ہے یہ ہیں ۔ خاقانی کی " تحفتہ العراقین " مارکس کا " سرمایہ " گوئٹے کا " دیوان مغربی " اور " فاؤسٹ "

" فلسفہ عجم اور انگریزی خطبات کی تصنیف میں انھوں نے بے شمار کتابیں حوالے کے طور پر استعمال کیں ۔ ان دونوں کتابوں کی تالیف کے زمانے میں بیس بائیس برس کا وقفہ ہے ۔ اول الذکر کتاب کی تیاری میں انھوں نے زیادہ تر ایران سے متعلق متصوفانہ اور مابعد الطبیعی تصانیف پر بھروسا رکھا اس مقالے کی تکمیل زیادہ سے زیادہ ایک اعلے درجے کی طالب علمانہ کوشش کا درجہ رکھتی ہے ایک ایسی کوشش جس کے اکثر پہلوؤں کے متعلق علامہ کے خیالات بعد ازاں بہت جلد بدل گئے تھے ۔ البتہ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ایک ایسی گراں مایہ تصنیف ہے جسے بجا طور پر ایک عظیم مجتہدانہ کارنامہ تسلیم کیا جا سکتا ہے جہاں تک ہمارا خیال ہے اس دوسری کتاب کے مطالب کے متعلق علامہ آخر دم تک مطمئن رہے اور اپنے شاہکار جاوید نامہ میں اس کی مشکلات کے پیش نظر اسے " حرف پیچاپیچ " کے نام سے یاد کیا ۔

ان دو تصنیفوں میں بعض ایسی کتابوں کے نام ملتے ہیں جنھیں علامہ قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن زیادہ تعداد ایسی کتابوں کی ہے جن سے جزوی طور پر انھوں نے کہیں مدد لی ہے یہ کتابیں ہمارے موضوع سے خارج سمجھی جانی چاہئیں ۔

اقبال کی محبوب اور پسندیدہ کتابوں کا اصل ذکر ان کے مکتوبات میں

ملتا ہے جو ان کی مدت العمر کی تصنیف ہیں اور جن میں ان کی زندگی کے قریب قریب ہر عہد کے رجحانات و احساسات دیکھے جا سکتے ہیں ۔ یہاں بعض کتابیں ایسی بھی نظر آتی ہیں جو باعتبار قیمت زیادہ اہم نہیں ہیں لیکن چونکہ علامہ نے غلط فہمی کی بنا پر انھیں دیکھنے کے لئے حد درجہ اشتیاق کا اظہار کیا ۔ اس لئے ہم ان کا ذکر کر دینا بھی مناسب سمجھتے ہیں اکثر خطوط میں جو نہایت بے تکلفانہ لکھے گئے ہیں بعض عظیم کتابوں کے متعلق علامہ کی رائے بھی موجود ہے ۔ آج کا مطالعہ انہیں خطوط کی روشنی میں کیا گیا ہے ۔

جن دو کتابوں سے اقبال مرحوم نے سب سے زیادہ فیض حاصل کیا ، وہ قرآن مجید اور مثنوی مولانا روم ہیں قرآن مجید سے تو ان کو عشق تھا ان کی ساری عمر قرآن کے تدبر میں گزری " اور اس غور و فکر کی مدد سے وہ اپنے ذہن سے مغربی فلسفے کی کدورت کے پردے اتارتے رہے ، آخر عمر میں ذہنی طور پر وہ مرد مومن تھے لیکن ان کی زندگی کا عملی پہلو کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھا اس کمی کا انھیں خود شدید احساس تھا ۔ وفات سے کچھ پہلے ان کی بڑی خواہش تھی کہ کوئی باعمل ، حساس اور قابل نوجوان مل جائے جس کے دل میں وہ اپنی روح کا اضطراب منتقل کر سکیں تاکہ احیائے دین کے اعلے مقصد کے لئے جس قسم کی پر اثر پرزور اور فعال شخصیت کی ضرورت ہے وہ زمانے کو میسر آجائے ۔

مولانا روم سے ان کو روحانی تعلق تھا ان کی مثنوی کو اقبال نے آخر دم تک حرزجان بنائے رکھا ، قرآن اور مثنوی رومیؒ سے اقبال کا تعلق ظاہر کرنے کے لئے حکیم محمد حسین صاحب عرشی کے نام مارچ ۱۹۳۵ء میں لکھے ہوئے ایک اہم خط کا ضروری حصہ یہاں درج کیا جاتا ہے :

" آپ اسلام اور اس کے حقائق کے لذت آشنا ہیں مثنوی رومی کے پڑھنے سے اگر قلب میں گرمی شوق پیدا ہو جائے تو اور کیا چاہیے

شوق خود مرشد ہے میں ایک مدت سے مطالعہ کتب ترک کر چکا ہوں اگر کبھی کچھ پڑھتا ہوں تو صرف قرآن یا مثنوی رومی افسوس ہے ہم اچھے زمانے میں پیدا نہ ہوئے:

کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں
ایک بھی صاحب سرور نہیں "

پھر فرمایا ہے کہ:

"مجھ سے ملتے رہیئے کیونکہ ایک ہی قسم کا شوق رکھنے والوں کی صحبت بعض دفعہ ایسے نتائج پیدا کر جاتی ہے جو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوتے یہ بات زندگی کے پوشیدہ اسرار میں سے ہے جس کو جاننے والے مسلمانان ہند کی بدنصیبی سے اب اس ملک میں پیدا نہیں ہوتے"۔

(مکاتیب حصہ اول صفحہ ۲۸)

قرآن حکیم اور مثنوی معنوی سے گہرے روحانی تعلق کا اظہار اقبال نے اپنی تصانیف میں جا بجا کیا ہے۔ اس کے لئے کسی حوالے کی ضرورت نہیں قارئین تھوڑی سی کوشش سے خود مستفیض ہو سکتے ہیں۔

جاوید نامہ علامہ اقبال کا شاہکار ہے یہ کتاب مثنوی رومی کی بحر میں لکھی گئی ہے۔ حافظ محمد اسلم جیراج پوری نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

ہم سنا کرتے تھے کہ فارسی زبان سیکھنے کے بعد صرف چار کتابیں اچھی پڑھنے کو ملتی ہیں شاہ نامہ فردوسی، مثنوی مولانا روم، گلستان سعدی اور دیوان حافظ۔ مگر اب جاوید نامہ کو بھی پانچویں

کتاب سمجھنا چاہیئے جو کہ معنویت اور نافعیت کے لحاظ سے ان سب پر فوقیت رکھتی ہے ۔ حقیقت میں یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس زمانے میں مسلمانان عالم کے نصاب میں شامل کرلی جائے "۔

(مقالات اسلم صفحہ ۸۰)

اس عظیم کتاب کی تصنیف میں اقبال نے بڑا زور مارا ۔ اس سلسلے میں بعض علمی مسائل کی تلاش اور چھان بین میں انھوں نے بے حد دماغ پاشی کی اور مختلف مطالب پیش کرنے میں انتہائی احتیاط سے کام لیا ہمارا خیال ہے کہ باستثنائے خطبات انگریزی انھیں کسی دوسری تصنیف کے لئے اتنی محنت اور دشواریوں سے دو چار نہیں ہونا پڑا ۔ فلسفہ اقبال کا کوئی اہم پہلو ایسا نہیں ، جو اس کتاب میں نہیں آگیا اگر " اسرار خودی " سے اقبال کے اصل پیغام کی ابتدا ہوئی تو کہا جا سکتا ہے کہ " جاوید نامہ " میں اس پیغام کی تکمیل ہوئی ۔

" جاوید نامہ " کی تصنیف ۱۹۲۹ء میں شروع ہوئی تھی ۔ جو لگاتار دو ڈھائی برس تک جاری رہی اور کتاب مکمل ہو کر اپریل ۱۹۳۱ء میں کتابت کے لئے کاتب کے حوالے کی گئی ۔ اس دوران میں اور اس سے کچھ مدت پہلے جن لوگوں کو اقبال سے ملنے یا ان کی گفتگو سننے کا موقع ملا ہے ، ان کا بیان ہے کہ وہ ہر وقت کچھ متفکر سے نظر آتے تھے اور ان کے لہجے سے کچھ ایسا ظاہر ہوتا تھا ، گویا کوئی بہت بڑا امتحان یا آزمایش درپیش ہے جس سے نبٹنے اور جس کے مراحل میں سے کامیاب گزر جانے کی تدبیر سوچ رہے ہیں یہ حالت برابر ڈھائی تین برس تک ان پر طاری رہی ۔ بالآخر ۲۲ اپریل ۱۹۳۱ء کو انھوں نے مولوی صالح محمد صاحب کو لکھا " کتاب " جاوید نامہ " جو میں لکھ رہا تھا ختم ہو گئی ہے ۔ آج کل میں کاتب کے حوالے کر دی جائے گی "۔

" جاوید نامہ " میں جو اہم مطالب بیان ہوئے ہیں ان سے قطع نظر سب

سے پہلی چیز جو پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہے وہ کتاب کی ترتیب ہے جو شاعر کے سماوی سفر سے متعلق ہے ۔ اطالوی شاعر ڈانٹے کی ڈیوائن کامیڈی کا طرز بھی یہی ہے یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ جاوید نامہ کی تصنیف اور طرز ترتیب کی محرک ڈیوائن کامیڈی ہوئی تھی یا کوئی اور خیال البتہ اتنا یقینی ہے کہ ڈیوائن کامیڈی جاوید نامہ کے زمانہ تکمیل میں اقبال کے پیش نظر رہی اس واقعہ کا ذکر اکثر مکاتیب میں ملتا ہے ۔ اقبال سمجھتے تھے کہ ڈانٹے کا تصور سماوات شیخ اکبر کی تصانیف خصوصاً " فتوحات مکیہ " اور دیگر اسلامی لٹریچر کا رہین منت ہے ۔ ایک خط میں اسی ضمن میں اسپین کے پروفیسر آسین کی تحقیقی کتاب " ISLAM AND DIVINE COMEDY " کا ذکر آیا ہے جس کے اقبال مداح تھے ۔

اپنے سماواتی سفر کے منازل متعین کرنے کے لئے علامہ نے بڑی احتیاط سے کام لیا اور آسمان کے متعلق غیر معروف ادب میں تلاش و تفحص کی امکان بھر کوشش کی ۔ اس زمانے میں تو یہ حال تھا کہ سیاروں کے متعلق کسی مشرقی بزرگ کی کسی کتاب کا نام سنتے تھے تو دیکھنے کے لئے بے تاب ہو جاتے تھے ۔ مثلاً علامہ عبدالعزیز کی کتاب " سیر السماء " کے لئے انھوں نے جو دوڑ دھوپ کی اس کا اندازہ مکاتیب سے بخوبی ہو جاتا ہے صرف اس کتاب کے حصول کے لئے مختلف دوستوں کے نام نہایت بے تابانہ خطوط لکھے ہیں جن کی ہر سطر بلکہ ہر لفظ میں ایک بے قرار اور مضطرب دل کی دھڑکن محسوس کی جا سکتی ہے ۔ صرف مولوی صالح محمد صاحب کے نام اس مطلب کے پانچ خطوط ہیں ۔ پہلے خط میں لکھتے ہیں " سیر السماء کا ذکر میں نے آج تک نہیں سنا اس کتاب کی تلاش بھی جاری رکھئے میں نہایت ممنون ہوں گا اگر سیر السماء ہی مل جائے " ۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں ا ۔ معلوم نہیں کتاب مذکور قلمی ہے یا طبع شدہ

اگر قلمی ہے تو معلوم نہیں حجم کس قدر ہے اور کس زبان میں ہے بہرحال اگر خواجہ صاحب کسی آدمی کو بھیج دیں تو بہت مہربانی ہو گی ۔ اس طرح کتاب جلد مل جائے گی اور میں اس سے اپنی کتاب ختم کرنے سے پہلے مستفیض ہو سکوں گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرا مقصود سیر السماء کے مطالعے سے علمی تحقیقات نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ میرا مقصود اس تحقیق سے ہے جس کی بناء مکاشفات قلبی پر ہو "

اسی خط میں جاوید نامہ کے متعلق فرماتے ہیں ۔ " جہاں تک میرا علم ہے کسی اسلامی زبان میں اس قسم کی کتاب اس سے پہلے نہیں لکھی گئی کتاب نظم میں ہے زبان فارسی مثنوی مولانا روم کی بحر میں ہے ۔ تیسری جگہ لکھا ہے ۔ " کتاب سیر السماء کے حصول میں خواجہ صاحب جو سعی بلیغ فرما رہے ہیں ، اس کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر کتاب مفید مطلب نکل آئی تو اپنی کتاب کے دیباچے میں اس کا ذکر کرنا ہو گا اور اس سلسلے میں علامہ عبدالعزیز مصنف کتاب مذکور کا ذکر بھی ضروری ہو گا ۔ علاوہ اس کے خواجہ صاحب موصوف کا بھی جن کی وساطت سے کتاب حاصل ہوئی " ۔

(مکاتیب جلد دوم صفحہ ۳۷۸)

اگلے خط میں ہے " میں اس کتاب کے لئے خود نواب صاحب بہادر والی بھاول پور کی خدمت میں لکھتا مگر اس معمولی بات کے لئے ان کو زحمت دینا پسند نہ کیا " ۔

پانچویں خط میں ہے " خواجہ صاحب کی خدمت میں میری طرف سے بہت بہت شکریہ ادا کیجئے کہ سیر السماء کے لئے انھوں نے بہاول پور خط لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ممکن ہے وہ کتاب شمس الدین صاحب کے کتب خانے میں محفوظ ہو ۔ اگر یہ کتاب مل گئی اور میرے مطلب کے موافق ہوئی تو امید ہے بہت فائدہ ہو گا ۔ "

(صفحہ ۳۸۳)

آخر کار معلوم ہوا کہ کتاب مذکور مولوی احمد سعید (بہاول پوری ؟) کے پاس ہے اندیشہ تھا کہ وہ کتاب عاریتہً نہ دیں گے ۔ تدبیر یہ ہوئی کہ کوئی صاحب ہمت کرکے مولوی احمد سعید صاحب کی موجودگی میں کتاب کا وہ حصہ دیکھیں جس کا تعلق سیارات اور متعلقہ سماوی امور سے ہے اور اگر اس کے مضامین مکاشفاتی ہیں تو جستہ جستہ نوٹ لیتے جائیں تاکہ کام بھی ہو جائے اور مولوی صاحب کتاب عاریتہً دینے سے بچ جائیں ۔

ادھر پروفیسر محمد شجاع منعمی صاحب کو بھی اس کتاب کے لئے لکھا ہوا تھا ۔ ان کے ذریعے کتاب دستیاب ہو گئی ان کو لکھتے ہیں : " آپ نے کتاب سیر السماء کے سلسلے میں جو زحمت گوارافرمائی اس کے لئے نہایت ممنون ہوں میں چاہتا ہوں کہ آپ کتاب کا بغور مطالعہ فرمائیں مجھے صرف اس اطلاع کی ضرورت ہے کہ آیا اس کتاب کا موضوع فلکیات سے ایک سائنٹفک بحث ہے یا صرف اس میں آسمان کی کیفیات تخیل یا مذہبی تجربہ یعنی مشاہدہ روحانی یا وحی و الہام کی بناء پر لکھی گئی ہیں اکثر مسلمان صوفیا نے آسمانوں سے اسی انداز سے بحث کی ہے ۔ اگر کتاب پر موخرالذکر صورت کا اطلاق ہوتا ہو تو میں یا خود آؤں گا یا چودھری محمد حسین صاحب کو بھیجوں گا " ۔

(مکاتیب اول صفحہ ۲۱۷)

پروفیسر منعمی کے نام ۲ جنوری ۱۹۳۱ء کا خط اس ڈرامائی پیچ و تاب اور امید و یاس کے جذبات کو نہایت بے دردی کے ساتھ خون کرکے رکھ دیتا ہے " میر سراج الدین صاحب میرے پرانے مہربان ہیں میں نے ان کو بھی اس کتاب کے لئے لکھا تھا ۔ بہرحال اب معلوم ہوا کہ کتاب میرے مطلب کی نہیں ہے " ۔

مولوی صالح محمد صاحب کے ذریعے حضرت خواجہ نظام الدین سے ایک خط میں دریافت کیا ہے کہ آیا ان کے بزرگوں کے کتب خانے میں حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری کا وہ رسالہ موجود ہے جس میں انھوں نے آسمانوں اور سیاروں کی سیر کا ذکر کیا ہے ۔ حضرت علامہ نے اس رسالے کے لئے بڑی جستجو کی مگر افسوس کہ دستیاب نہ ہو سکا ۔

تصور سماوات کے بعد زمان و مکان کا مسئلہ دوسرا اہم موضوع ہے جس کی تحقیق میں اقبال پریشان اور ہمہ تن جستجو نظر آتے ہیں ۔ یہ تلاش و تحقیق جاوید نامہ کے زمانہ تصنیف سے کچھ پہلے شروع ہو گئی تھی اور اس کی تکمیل کے کچھ عرصے بعد تک جاری رہی تھی ۔ " جاوید نامہ " میں روح زمان و مکان کے احوال و ارشادات کے علاوہ اس سے پیشتر خطبات میں بھی علامہ نے اسلامی صوفیا کے زمانی و مکانی نظریوں کو پیش کیا ہے اور مغربی حکماء کے متعلقہ افکار سے ان کا موازنہ کرکے مسلمان صوفیوں کی ذہنی فوقیت اور اس میدان میں ان کی سبقت و اولیت ثابت کی ہے ۔ جاوید نامہ کی تصنیف کے بعد علامہ کی تحقیق زمان و مکان اس لئے جاری رہی کہ وہ اس زمانے میں آکسفورڈ یونیورسٹی کی دعوت پر رہوڈز لیکچرز کی تیاری میں مصروف تھے ۔

مسئلہ زمان و مکان کے متعلق اکثر خطوط میں بعض نہایت قیمتی اور نایاب کتابوں کا ذکر آیا ہے ۔ اس سلسلے میں علامہ کا سب سے پہلا خط سید سلیمان ندوی کے نام ہے جو اگست ۱۹۲۲ء میں لکھا تھا ۔ دریافت فرماتے ہیں :

" مولانا حکیم برکات احمد صاحب بہاری ثم ٹونکی کا رسالہ تحقیق زمان مطبوعہ ہے یا قلمی ؟ اگر قلمی ہے تو کہاں سے عاریتہً ملے گا ؟ علیٰ ہذا القیاس مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ کی طبقات قاضی محب اللہ کی جواہر الفرد اور حافظ امان اللہ بنارسی کی تمام تصانیف کہاں سے دستیاب ہوں گی ؟ زمان و مکان و حرکت کی بحث

اس وقت فلسفے اور سائنس کے مباحث میں سب سے زیادہ اہم ہے میری ایک مدت سے خواہش ہے کہ اسلامی حکماء و صوفیاء کے نقطہ نگاہ سے یورپ کو روشناس کرایا جائے مجھے یقین ہے کہ اس کا بہت اچھا اثر ہو گا"۔

(مکاتیب اول صفحہ ۱۲۳)

سید صاحب ہی کے نام دوسرا خط مارچ ۱۹۲۸ء میں لکھا ہے "شمس بازغہ یا صدرامیں جہاں زمان کی حقیقت کے متعلق اقوال نقل کئے ہیں ان میں ایک قول یہ ہے کہ زمان خدا ہے۔ بخاری میں ایک حدیث بھی اس مضمون کی ہے۔ لاتسبوا الدہر، کیا حکماء اسلام میں سے کسی نے یہ مذہب اختیار کیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو یہ بحث کہاں ملے گی؟

"قرون وسطیٰ کے ایک یہودی حکیم موسیٰ بن میمون نے لکھا ہے کہ خدا کے لئے کوئی مستقبل نہیں ہے بلکہ وہ زمان کو لحظہ بہ لحظہ پیدا کرتا ہے۔۔۔ متکلمین کے خیالات پر بھی اس نے جرح قدح خوب کی ہے۔ میرا گمان ہے کہ میمون کا مذکورہ بالا مذہب بھی ضرور کسی نہ کسی مسلمان حکیم کی خوشہ چینی ہے۔ اگر آپ کے علم میں یہ بات ہو تو مہربانی کرکے مطلع فرمایئے۔ ایک مضمون لکھ رہا ہوں جس کا عنوان ہے "زمان کی حقیقت فلسفہ اسلام کی تاریخ میں"

(صفحہ ۱۵۷)

اسی مارچ ۱۹۲۸ء میں دوسرا خط تحریر کیا ہے۔ "مباحث مشرقیہ (۱)" لاہور میں دستیاب نہیں ہو سکتی کیا یہ ممکن ہے کہ آپ زمان کے متعلق امام رازی کے خیالات کا خلاصہ قلم بند فرما کر مجھے ارسال فرما دیں"۔

یہ خطبات انگریزی کی تیاری کا زمانہ ہے۔ مندرجہ اقتباسات سے پتا چلتا ہے کہ خطبات کے زمانی و مکانی پہلو کی تحقیق انھوں نے ۱۹۲۲ء ہی میں

شروع کر دی تھی جب وہ پیام مشرق کی تصنیف میں دن رات منہمک تھے " پیام مشرق " کی بعض نظموں میں بھی مسئلہ زمان کے بعض پہلوؤں کے متعلق نہایت عمدہ اور خیال انگیز اشعار ملتے ہیں مثنوی " اسرار خودی " کی نظم " الوقت سیف " " امام شافعیؒ کے مقولہ پر نہایت تابناک حاشیہ آرائی ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ مسئلہ زمان پر علامہ کی اصل تحقیق کے نتائج خطبات اور بعد کی تصانیف میں درج ہوئے ہیں ۔ خطبات کی تصنیف کے بعد یہ نتائج جاوید نامہ کے متعلقہ حصہ کا پس منظر بنے اور بالآخر رہوڈز لیکچرز کی تجویز میں کام آنے والے تھے ۔ جن میں مسئلہ زمان و مکان کے متعلق اسلامی نقطہ نظر خاص موضوع تھا افسوس ہے کہ یہ لیکچرز کبھی نہ لکھے گئے کیونکہ بعض وجوہ کی بنا پر علامہ نے انھیں قلم بند کرنے کا خیال آخر وقت میں ترک کر دیا تھا ۔

مکاتیب اقبال کی اشاعت سے جہاں اور بے شمار انکشاف علامہ کی حیات اور کلام کے متعلق ہوئے ہیں ، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ مسئلہ زمان و مکان سے ان کی حد سے زیادہ دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے ۔ مجوزہ رہوڈز لیکچرز کے مواد کی تلاش میں ان کے ذوق و شوق اور سرگردانی کا ثبوت مکاتیب میں موجود ہے ۔ ذیل کے اقتباسات سے اس کی وضاحت ہو گی ۔

۸ ۔ اگست ۱۹۳۳ء کو سید سلیمان ندوی صاحب کو لکھتے ہیں ۔ " حضرت محی الدین ابن عربی کے فتوحات یا کسی اور کتاب میں حقیقت زمان کی بحث کس کس جگہ ہے ۔ حوالے مطلوب ہیں (۲) ۔ حضرات صوفیہ میں اگر کسی اور بزرگ نے بھی اس مضمون پر بحث کی ہو تو اس کے حوالے سے بھی آگاہ فرمائیے (۳) ۔ متکلمین کے نقطہ خیال سے حقیقت زمان یا آن سیال پر مختصر اور مدلل بحث کون سی کتاب میں ملے گی ؟ امام رازی کی مباحث مشرقیہ آجکل دیکھ رہا ہوں " ۔

اسی تاریخ کو ایک خط پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی کے نام لکھا ہے جس میں ابن عربی پر ایک لیکچر کے لئے ذیل کی معلومات مانگی ہیں ۔ (۱) " اول یہ کہ حضرت شیخ اکبر نے تعلیم حقیقت زمان کے متعلق کیا کہا ہے اور ائمہ متکلمین سے کہاں تک مختلف ہے (۲) ۔ یہ تعلیم شیخ اکبر کی کون کون سی کتب میں پائی جاتی ہے اور کہاں کہاں (۳) ۔ حضرات صوفیہ میں سے اگر کسی بزرگ نے بھی حقیقت زمان پر بحث کی ہو ، تو ان بزرگ کے ارشادات کے نشان بھی مطلوب ہیں ۔ مولوی سید انور شاہ مرحوم و مغفور نے مجھے عراقی کا ایک رسالہ مرحمت فرمایا تھا ۔ اس کا نام تھا " فی دراتیہ الزمان " جناب کو ضرور علم ہو گا میں نے یہ رسالہ دیکھا ہے مگر چونکہ یہ رسالہ بہت مختصر ہے ۔ اس واسطے مزید روشنی کی ضرورت ہے " ۔

(مکاتیب جلد اول صفحہ ۴۴۴)

۴ ستمبر ۱۹۲۳ء کو سید سلیمان صاحب کے نام " رسالہ اتقان فی ماہیہ الزمان آج مل گیا میں نے اس کے لئے ایک دوست کو ٹونک لکھا تھا آج مولوی برکات احمد کو ایک اور رسالے کے لئے جو اردو میں ہے لکھا ہے " ۔

اسی خط میں ہے " شرح مواقف دیکھ رہا ہوں ۔۔۔۔۔ نور الاسلام کا عربی رسالہ بابت مکان جو رام پور میں ہے کس زبان میں ہے قلمی ہے یا مطبوعہ ۔ نور الاسلام کا زمانہ کونسا ہے ؟ "

۱۷ ۔ ستمبر ۱۹۲۳ء کو سید صاحب ہی کے نام " حضرت ابن عربی کے خیالات و افکار بھیجنے کا جو وعدہ آپ نے فرمایا اس کے لئے بیحد شکر گزار ہوں ۔ مولوی سید برکات احمد صاحب کا رسالہ میں نے دیکھا ہے ۔ انشاء اللہ اسے سبقاً سب پڑھوں گا ۔ مسئلہ آن کے متعلق ابھی تک مشکلات باقی ہیں ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فلاسفہ پر جو اعتراض ہمارے متکلمین نے کئے ہیں ، وہ مسئلہ زمان

کے متعلق خود ان کے افکار پر بھی عائد ہوتے ہیں ۔ مولوی سید برکات احمد مرحوم نے دہر اور زمان میں امتیاز کرکے کسی قدر مشکلات کو کم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن حق یہ ہے کہ مسئلہ نہایت مشکل ہے ۔ ممکن ہے حضرت ابن عربی اس پر روشنی ڈال سکیں "۔

(صفحہ ۱۶۹)

سید صاحب کے نام ۹ ۔ دسمبر ۱۹۳۳ء " مولوی نورالاسلام کے رسالہ فی تحقیق المکان کی نقل رام پور کے کتب خانہ سے آگئی ہے ۔ اب آپ کے ایفائے وعدہ کا انتظار ہے "۔

حضرت محی الدین ابن عربی کے خیالات و افکار کی تحقیق سید صاحب نے بھیجی تو انھیں لکھا " اگر دہر ممتد اور مستمر ہے اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی ہے تو پھر مکان کیا چیز ہے جس طرح زمان دہر کا ایک طرح سے عکس ہے اسی طرح مکان بھی دہر ہی کا عکس ہونا چاہیئے ۔ یا یوں کہیئے کہ زمان و مکان دونوں کی حقیقت اصلیہ دہر ہی ہے ۔ کیا یہ خیال محی الدین ابن عربی کے نقطہ خیال سے صحیح ہے ؟ اس کا جواب شاید فتوحات ہی میں ملے " ۔ ۱۵ ۔ دسمبر ۱۹۳۳ء

اسی خط میں ہے " میں نے زمان و مکان کے متعلق تھوڑا سا مطالعہ کیا ہے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے بڑے بڑے مسائل پر غور و فکر کیا ہے اور اس غور و فکر کی تاریخ لکھی جا سکتی ہے یہ کام صرف آپ ہی کر سکتے ہیں میرے خیال میں آپ کو چاہیے کہ اس کام کو اپنی زندگی کے اہم مقاصد میں شمار کریں "۔

(صفحہ ۱۸۰)

سید محفوظ علی صاحب بدایونی کو ۲۱ دسمبر ۱۹۳۳ء کو لکھتے ہیں : " کیا

مسلمان ریاضی دانوں میں کوئی اس بات کا بھی قائل ہوا ہے کہ مکان کے ابعادتین سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں یا نہیں ؟ شاید نصیر الدین طوسی نے ایسے امکان کا کہیں ذکر کیا ہے مگر حوالہ یاد نہیں آپ کے بدایوں میں ایک بزرگ ہیں جنھوں نے کچھ مدت ہوئی ایک رسالہ علم ہیئت پر شائع کیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مہربانی کرکے ان سے دریافت فرما کر مجھے مطلع فرمائیے "۔

(صفحہ ۲۴۷)

مسئلہ زمان و مکان کے متعلق آخری خط ماسٹر محمد عبد اللہ چغتائی کے نام ہے ۔ جو اس وقت یورپ میں مقیم تھے ۔ یہ خط ۱۳ جون ۱۹۳۷ء کو لکھا گیا تھا بظاہر اس وقت عوارض جسمانی نے نڈھال کر رکھا تھا مگر ذہنی طور پر علامہ آخر دم تک جواں مرد رہے ۔چنانچہ اس خط میں جناب چغتائی کے ذریعہ اسپین میں مقیم ایک فاضل جناب محمود خضیری کے لئے زمان و مکان پر ریسرچ کرنے کی تجویز پیش کرتے ہیں ۔ ضمناً عراقی کے رسالہ زمان کا ذکر بھی آیا ہے فرماتے ہیں : " ممکن ہے مکان کے ابعادتین سے زیادہ ہوں اور اسلامی صوفیا تو ایک مدت سے تعدد زمان و مکان کے قائل ہیں یہ خیال یورپ میں سب سے پہلے جرمن فلسفی کانٹ نے پیدا کیا تھا لیکن مسلمان صوفیا اس سے پانچ چھ سو سال پہلے اس نکتے سے آشنا تھے عراقی کے رسالے کا قلمی نسخہ غالباً ہندوستان میں موجود ہے اور میں نے ان کے ایک رسالہ کا جو خاص طور پر زمان و مکان پر ہے اپنے لیکچروں میں ملخص بھی دیا ہے ۔ اگر محمود خضیری بھی ان مضمون پر ریسرچ کریں تو مجھ کو یقین ہے کہ یورپ میں نام پیدا کریں گے "۔

(مکاتیب جلد دوم صفحہ ۳۴۴)

جاوید نامہ میں سلطان شہید ٹیپوؒ کا ذکر اقبال نے جس سوز اور خلوص کے ساتھ کیا ہے اس کی مثال کم ملے گی ۔ سلطان شہیدؒ کے متعلق تڑپا دینے

والے اشعار کہنے سے پہلے علامہ نے متعلقہ ضروری کتابوں سے استفادہ کر لیا تھا ۱۹۲۹ء کے ڈائل میں آپ اپنے لیکچروں کے سلسلے میں گھومتے ہوئے سرنگاپٹم کی زیارت کے لئے بھی گئے تھے ۔ سلطان کے مقبرے پر ایک قلمی مسودہ تاریخ ملا تھا پھر مسٹر محمد جمیل (نبگوری ؟) نے سلطان کے ایک روزنامچہ کی اطلاع بھی علامہ کو دی تھی جسے دیکھنے کا آپ نے شوق ظاہر فرمایا تھا ۔ اور انھیں لکھا تھا " میں اس سے ضروری نوٹ لے کر واپس کر دوں گا " دوسرے خط میں لکھا " میرے لئے یہ نسخہ ایک گنج گراں بہا ہو گا ۔ اس روزنامچہ سے امید ہے کہ سلطان سے متعلق مجوزہ نظم میں مجھے سلطان شہیدؒ کی صحیح صحیح حالت پیش کرنے میں بہت امداد ملے گی " ۔

مجوزہ نظم کے متعلق فرمایا ہے : " سلطان شہیدؒ پر میری نظم اس کتاب کا حصہ ہو گی جسے میں اپنی زندگی کا ماحصل بنانا چاہتا ہوں " ۔

تصوف ایک اہم موضوع ہے جس کے مطالعہ میں اقبال کی زندگی کا بڑا حصہ گزرا مولوی اسماعیل شہید رحمتہ اللہ علیہ کے بعد ہندوستان میں اقبال غالباً پہلے عالم ہیں جنھوں نے مروجہ تصوف اور بعض صوفیانہ مشاغل کے خلاف آواز بلند کی علامہ نے صوفی کے مشاغل کے خلاف کم ، زیادہ اس تصوف کی روح کے خلاف آواز اٹھائی تھی جس کی بدولت درویشی بھی عیاری نظر آنے لگتی ہے ۔ اقبال نے یہ مصلحانہ آواز تو بلند کر دی لیکن مخالفت عصبیت کا طوفان تھا کہ تھمنے ہی میں نہ آتا تھا ۔ علامہ اگر بعض شخصیتوں کا نام نہ لیتے تو ممکن ہے باد مخالف کے تند جھونکے مدھم پڑ جاتے مگر وہ تھے کہ پیغمبرانہ شان کے ساتھ اپنے مقام پر ڈٹے رہے اور مزید تشریح و توضیح کے طور پر مخالفوں کے خطوط میں وضاحت کرتے رہے رسائل میں مضامین لکھتے رہے ، جن کا سلسلہ اردو کے مجلوں سے گزر کر انگریزی کے میگزینوں تک جا پہنچا ہمارا اندازہ ہے

کہ اقبال مرحوم نے تصوف کے متعلق اپنے نقطہ خیال کی توضیح اور مسئلہ خودی کی تشریح کے طور پر جتنے مضامین مختلف رسائل میں شائع کرائے تھے ان کی مجموعی تعداد دیگر جملہ موضوعوں پر ان کے عمر بھر کے لکھے ہوئے مضامین سے زیادہ ہے ۔ اس کے باوجود اکثر مخالفین پھر بھی قائل نہ ہوئے ۔ اور مولانا اکبر الہ آبادی کی طرح بے شمار بدگمانیوں کو قبر تک اپنے ساتھ لے گئے ۔

اقبال تصوف کے دشمن نہ تھے ۔ وہ صرف اسلامی تصوف کو عجمیت سے پاک کرنا چاہتے تھے ۔ ان کے مضامین کو بعض لوگوں نے تصوف کی دشمنی پر محمول کیا جس کا انھیں بے حد افسوس تھا اس کی شکایت جنوری ۱۹۱۸ء میں سرکشن پرشاد کو لکھی تھی " افسوس ہے کہ بعض نا واقف لوگوں نے میرے مضامین کو تصوف کی دشمنی پر محمول کیا " ۔

۱۹۱۶ء میں علامہ ابن جوزیؒ کا رسالہ تصوف شائع کرنے کا خیال تھا جس کے شروع میں تاریخ تصوف پر مفصل دیباچہ لکھنے کا ارادہ تھا مگر افسوس رسالہ شائع نہ ہوا ۔ البتہ تاریخ تصوف والے مضمون کی تیاری میں انھوں نے بہت وقت صرف کیا اور اس میں منصور حلاج کے رسالہ کتاب الطواسین سے بھی مدد لی خیال ہے کہ یہ اہم مضمون کہیں ضرور شائع ہوا ہو گا ۔ اس کے بعد تقویۃ الایمان کی طرف بھی انھوں نے توجہ کی تھی ۔

تصوف کی کتابوں کی تلاش انھوں نے اسرار خودی کے اٹھائے ہوئے طوفان کے گزر جانے کے بعد تک بھی جاری رکھی ۔ اگست ۱۹۲۰ء میں پروفیسر محمد اکبر منیر صاحب کو جو اس وقت ایران میں ٹھہرے ہوئے تھے تصوف اور فلسفہ کی نئی کتابوں کے لئے لکھتے ہیں ۔ اس خط میں جدید فارسی شاعری پر بھی اظہار خیال کیا ہے اور کہا ہے کہ " ایرانی شاعری کا تو قاآنی پر خاتمہ ہو گیا " پھر لکھا ہے ۔ " تصوف کی کتابوں کا جمع کرنا بھی مفید ہو گا ۔ حال کے ایرانی حکماء

میں ہادی سبزواری مشہور ہیں ان کی کتاب " اسرار الحکم " میری نظر سے گزری ہے محض افلاطونیت کا چربہ ہے اور بس حال کے دیگر حکما میں سے اگر کسی کی تصنیفات آپ کے ہاتھ آجائیں تو غنیمت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک کتاب " لطائف غیبی " نام ایران میں شائع ہوئی تھی ۔ پروفیسر برؤن نے لٹریری ہسٹری میں اس کا ذکر کیا ہے ۔ یہ کتاب ان اعتراضات کے جواب میں لکھی گئی ہے جو شیعہ حضرات نے وقتاً فوقتاً خواجہ حافظ پر کئے ہیں ۔ اگر کہیں سے دستیاب ہو جائے تو میرے لئے خرید کر کے بھیج دیجئے " ۔

(مکاتیب جلد دوم صفحہ ۱۵۸)

فقہ اسلامی اور علم کلام کی تدوین جدید کی طرف اقبال بہت عرصے تک متوجہ رہے ، وہ سمجھتے تھے کہ عصر حاضرہ کے مسائل سے اسلامی اصولوں کی فروعات کو ہم آہنگ کرنے کے لئے فقہ کی از سر نو تشکیل ہو جانی چاہیئے اور نئے زمانے کے تقاضوں کے سامنے نئی دنیا والوں کے لئے اسلام کو قابل قبول بنانے کی غرض سے جدید علم کلام مرتب ہو جانا چاہیئے تاکہ ہمارا علم دینیات افکار جدیدہ کا ہمدوش ہو سکے ۔ اس دوسرے مقصد ہی کی خاطر انگریزی خطبات اور بعض دیگر اہم مضامین لکھے گئے ۔ پہلا مقصد بھی اتنا ہی اہم تھا مگر اس سے عہدہ برآ ہو لینا اقبال مرحوم کے بس میں نہ تھا اس لئے وہ عمر بھر دوسروں کی طرف دیکھتے رہے اور ان کو اس کار عظیم کی طرف متوجہ کرنے کے لئے اکساتے رہے ۔ آپ فرمایا کرتے تھے ، اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو میں ان سے فقہ اسلامی کی تاریخ لکھنے کی درخواست کرتا بعدازاں ندوے والوں نے فقہ اسلامی کی تاریخ پر بعض اہم کتابیں ترتیب دیں ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ان ہی گزارشات اور دوستانہ مشوروں کا نتیجہ ہیں جو مرحوم علامہ سید سلیمان صاحب کی خدمت میں پیش کرتے رہتے تھے ۔

زمانے کی سرد مہری دیکھ کر آخر عمر میں علامہ خود ایک کتاب اسلامی اصول فقہ پر تحریر کرنا چاہتے تھے مگر ضعف بصارت کی وجہ سے یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا ستمبر ۱۹۳۷ء میں خواجہ غلام السیدین کو لکھتے ہیں " اسلامی اصول فقہ کے متعلق ایک کتاب لکھنے کا ارادہ تھا لیکن اب یہ امید موہوم معلوم ہوتی ہے " ۔

خواجہ حافظ کی سیرت اور شاعری اقبال کا خاص موضوع تھا اسرار خودی نے دلوں میں جو آگ لگائی تھی ، اس کے بھڑکانے میں تیل کا کام خواجہ کے نام ہی نے دیا تھا ۔ اگر اقبال اپنی توضیحات میں خواجہ کا ذکر نہ لاتے تو یقیناً یہ آگ سلگتی ہی نہیں ۔ لوگ خودی کی نئی اور بظاہر نامانوس تعبیر کو زیادہ سے زیادہ ایک مغرب زدہ فلسفی کی بڑخیال کرکے مطمئن ہو جاتے یہ آگ جو اپنے ابدی نقوش گردو پیش میں چھوڑ گئی ہے اس وقت تک فرو نہ ہوئی جب تک " اسرار" کے دوسرے ایڈیشن میں خواجہ کے متعلق اشعار کو حذف کرکے ان کی جگہ ایک عام موضوع " درحقیقت شعر و اصلاح ادبیات اسلامیہ " اختیار نہ کر لیا گیا ۔ افسوس ہے کہ پہلے ایڈیشن کا مفید دیباچہ بھی اسی حذف اور قطع و برید کی نذر ہو گیا ۔

خواجہ حافظ کی شاعری کے اثرات سے قطع نظر ان کی غزل کو اقبال نے اپنی غزل کے لئے بطور نمونہ اور معیار ہمیشہ اپنے سامنے رکھا ۔ خواجہ کی غزل کی حلاوت اور لطافت پر وہ مفتون تھے یہی وجہ ہے کہ اقبال کی غزل نے جتنا اثر حافظ کی غزل سے قبول کیا اور کسی شاعر سے قبول نہیں کیا ۔

مکاتیب اقبال حصہ اول میں مولوی سراج الدین پال کے نام جو خطوط ہیں وہ اس اعتبار سے بڑے اہم ہیں کہ ان میں مولوی صاحب کو حافظ پر عقلی اور اخلاقی نقطہ نظر سے تحقیق کرنے کا پر زور مشورہ دیا ہے ۔ اور موضوع سے

متعلق بے شمار کتابیں بھی تجویز کی ہیں ۔ ان کتابوں میں شاہ جہانگیر اشرف کے " ملفوظات " کا نام بھی ہے ۔ یہ بزرگ حافظ کے ہم عصر تھے ۔ اور بقول جامع " ملفوظات " شاہ جہانگیر اشرف کی رائے میں حافظ اپنے زمانے میں ایک ولی کامل تصور کئے جاتے تھے ۔ اقبال اس معاصرانہ شہادت کے متعلق خود بھی جستجو کرتے رہے اور مولوی سراج الدین پال صاحب سے بھی زور دار الفاظ میں جستجو کرنے کی سفارش کی ۔

پروفیسر الیاس برنی نے قادیانی مذہب کے متعلق کچھ کتابیں لکھی تھیں ۔ ان کا ذکر بھی علامہ کے خطوط میں ملتا ہے ۔

ان ہی پروفیسر صاحب کی کتاب " المعیشت " چھپ کر اقبال کے پاس پہنچی تو دیکھ کر بہت خوش ہوئے ۔ اس شعبہ علم میں آپ خود ایک عدد رسالہ کے مصنف تھے لیکن تحسین و توصیف کا حوصلہ ملاحظہ ہو ، پروفیسر برنی کو لکھتے ہیں : " آپ کی تصنیف اردو زبان پر ایک احسان عظیم ہے مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ اردو زبان میں علم الاقتصاد پر یہ پہلی کتاب ہے اور ہر پہلو سے کامل " ۔

علم المعیشت پر علامہ کی اپنی تصنیف کا نام " علم (۲) الاقتصاد " تھا ۔ جو اردو میں اس موضوع پر یقیناً اولین کتاب تھی اور برنی صاحب کی تالیف سے کم از کم پندرہ سولہ برس پہلے شائع ہو چکی تھی ۔

پروفیسر محمد اکبر منیر صاحب کے خطوط اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان میں اکثر اچھی کتابوں کا ذکر آیا ہے ، ایک خط میں یونانی فلسفے پر ایک انگریزی کتاب " A CRITICAL HISTORY OF GREEK PHILOSOPHY " کی تعریف فرماتے ہیں ۔ " اس سے صاف اور واضح کتاب آج تک میری نظر سے نہیں گزری ۔ بعد کا یورپین فلسفہ سمجھنے میں اس سے بڑی

مدد ملے گی "

(۴ ۔ اگست ۱۹۳۰ء)

ایک دوسری جگہ ایران کے ملا صدر الدین کی کتاب " ملا صدرا " کے مطالعہ کا ذکر کرتے ہیں اور پھر انہی بزرگ کی تفسیر قرآن کے متعلق اظہار رائے کیا ہے " بعض مقامات تو خوب ہیں مگر بحیثیت مجموعی اس کا پایہ تفاسیر میں بہت کم ہے " ۔

منشی غلام قادر فصیح سیال کوٹی کی تاریخ اسلام پر اظہار خیال کرتے ہیں : " خود مجھ پر جو اثر اس کے مطالعے سے ہوتا ہے اس کا اظہار اس سے بہتر الفاظ میں نہیں کر سکتا کہ بسا اوقات دوران مطالعہ میں چشم پر آب ہو جاتا ہوں ۔ اس کا اثر میرے دل پر کئی کئی دن رہتا ہے ۔ خدا کرے کوئی مسلمان گھر اس رسالے سے خالی نہ رہے " ۔

ایک مکتوب میں منشی محمد دین فوق کی کتاب " حریت اسلام " کی تعریف کی ہے ۔

شیخ محمد اکرام نے غالب نامہ شائع کرایا تو علامہ نے دیکھ کر انھیں لکھا : " مجھے آپ کے چند نتائج سے اتفاق نہیں میرا ہمیشہ سے خیال رہا ہے کہ حضرت غالب کو اردو نظم میں بیدل کی تقلید میں ناکامی ہوئی ۔ غالب نے بیدل کے الفاظ کی نقالی ضرور کی لیکن بیدل کے معانی سے اس کا دامن تہی رہا بیدل کا راہوار فکر اپنے ہمعصروں کے لئے ذرا گریز پا تھا اس امر کے ثبوت میں شہادت پیش کی جا سکتی ہے کہ ہند اور بیرونی ہند کے معاصرین بیدل اور دوسرے دل دادگان نظم فارسی بیدل کے نظریہ حیات کو سمجھنے میں قاصر رہے ہیں " ۔

(۱۲ ۔ مئی ۱۹۳۷ء)

اکثر یورپین مستشرقین کے اقبال زیادہ قائل نہ تھے فرماتے تھے ۔" ان کی تصانیف سیاسی پروپیگنڈا یا تبلیغی مقاصد کی تخلیق ہوتی ہیں " ۔

ایک مقام پر فرانسیسی حکیم ڈے کارٹ کی کتاب METHOD کے متعلق لکھا ہے : " اگر ڈے کارٹ عربی کا عالم ہوتا تو ہم اسے غزالی کی احیاء العلوم سے چوری کرنے کا الزام لگاتے ایسے ہی ڈانٹے کی کتاب " ڈیوائن کامیڈی " محی الدین ابن عربی کے افکار و تخیلات سے لبریز ہے " ۔

مکاتیب میں بعض تصانیف شاہ ولی اللہؒ کا ذکر بھی آیا ہے ۔ مثلاً خیر کثیر تفہیمات الہیہ ، حجتہ اللہ البالغہ وغیرہ مولانا رومی کی " فیہ ما فیہ " نصیر الدین ہاشمی کی " دکن میں اردو " شمس بازغہ اور بدور البازغہ کے نام بھی ملتے ہیں ۔

علامہ کی بعض اپنی تصانیف کے متعلق ان کی رائے بھی دیکھنے میں آئی ہے فلسفہ عجم کے متعلق ایک صاحب کو لکھتے ہیں ۔ " خود میرے خیال میں بہت سا انقلاب آچکا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے خیال میں اس کتاب کا اب تھوڑا سا حصہ باقی ہے جو تنقید کی زد سے بچ سکے " ۔ مثنوی اسرار کے متعلق جناب شوکت حسین صاحب کو لکھا : " اسرار خودی " اقبال کا قال ہے ممکن ہے آپ کا حال ہو " ۔

زبور عجم کے متعلق مشہور شعر ہے :

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبور عجم
نوائے نیم شبی بے نوائے راز نہیں

پیام مشرق کے متعلق کہا تھا ۔ ماہ تابے ریختم برشام شرق اور جاوید نامہ کے متعلق ع ایں کتاب از آسمانے دیگر است

ایک زمانے میں شکوہ اور جواب شکوہ پر (کسی صاحب کی فرمائش پر) مولانا اکبر الہ آبادی سے دیباچہ لکھوانے کا خیال تھا ۔

ایک جگہ نہایت عجیب و غریب خیال کا اظہار کیا ہے ۔ سرکشن پرشاد کو لکھتے ہیں " میرا ارادہ رامائن کو اردو میں لکھنے کا ہے ۔ سرکار کو معلوم ہو گا مسیح جہانگیری نے رامائن کے قصے کو فارسی میں نظم کیا ہے ۔۔۔۔۔ میرے خیال میں اسی کا تتبع بہتر ہو گا " ۔

لندن میں ایک دفعہ عطیہ بیگم فیضی صاحبہ نے غزلیات کا مجموعہ شائع کرانے کے متعلق دریافت کیا تو ان کو لکھا : غزلوں کا مجموعہ شایع کرانے کا آرزو مند ہوں ۔ یہ مجموعہ ہندوستان میں طبع ہو گا جرمنی میں جلد بندھے گی اور ایک " ہندوستانی خاتون کے نام سے فخر انتساب حاصل کرے گا " غالباً خود عطیہ بیگم مراد ہیں ۔

جولائی ۱۹۱۱ء میں اقبال کے والد بزرگوار نے ان سے فرمائش کی کہ بوعلی قلندر کی مثنوی کے طرز پر ایک فارسی مثنوی لکھو ۔ انھوں نے اس راہ کی مشکلات کے باوجود کام شروع کر دیا ۔ حضرت اکبر الہ آبادی کے ملاحظے کے لئے تمہید کا بند لکھتے ہیں :

نالہ را انداز نو ایجاد کن
بزم را از ہا و ہو آباد کن
آتش استی بزم عالم بر فروز
دیگراں را ہم ازیں آتش بسوز
سینہ را سر منزل صد نالہ ساز
اشک خونیں را جگر پرکالہ ساز
پشت پا بر شورش دنیا بزن
موجہ بیرون ایں دریا بزن

ان میں سے پہلے دو شعر مثنوی اسرار کی تمہید کا جزو بن گئے پہلا شعر تمہید

کے صفحہ ۹ پر جوں کا توں موجود ہے ۔ دوسرا شعر کچھ بعد میں درج ہوا ہے لیکن تھوڑے سے تغیر کے ساتھ :

آتش است بزم عالم بر فروز
دیگراں را ہم ز سوز خود بسوز

نئے الفاظ میں اسرار خودی کا پرتو آگیا ہے تیسرے اور چوتھے شعر کا پتا نہیں چلا البتہ کسی دوسری جگہ " پشت پا برگردش دنیا بزن " کو زیادہ پختہ کلام " پشت پا برگردش ایام زن " میں بدل دیا ہے ۔

۱۹۱۸ء میں مثنوی اسرار اور رموز کے بعد اس کا تیسرا حصہ لکھنے کا ارادہ تھا ۔ مولانا اکبر کو دو شعر ارسال کئے ہیں :

در جہاں مانند جوئے کوہسار
از نشیب و ہم فراز آگاہ شو
یا مثال سیل بے زنہار خیز
فارغ از پست و بلند راہ شو

جیسا کہ معلوم ہے مثنوی کا تیسرا حصہ تو نہ لکھا گیا ، البتہ یہ شعر پیام مشرق کے خردہ کا جزو بن گئے ۔

دنیا کی دوسری عظیم کتابوں کی طرح " جاوید نامے کو مصور کرنے کی بھی انھیں خواہش تھی ۔ ضرار احمد کاظمی صاحب کو انتقال سے صرف تین روز پہلے لکھا ۔ " پوری مہارت فن کے بعد اگر آپ نے جاوید نامہ پر خامہ فرسائی کی تو ہمیشہ زندہ رہیں گے " ۔

اجتہاد پر ایک رسالہ بھی اقبال نے قلمبند کیا تھا لیکن بعض امور کے متعلق وہ خود مطمئن نہ تھے اس لئے شائع نہ ہوا ۔ مولوی عبدالماجد صاحب نے بھی اس پر خاصی مخالفانہ رائے دی تھی ۔

ایک کتاب بعنوان " ISLAM AS I UNDERSTAND IT "
لکھنے کا خیال تھا ۔ مگر لکھنے کی نوبت نہ آئی مرحوم کے افکار و تخیلات کا سب سے بڑا منبع قرآن حکیم تھا ۔ ان کی جملہ تصانیف تقریباً کلی طور پر اصل اسلامی روح کو پیش کرتی ہیں اور اسلام کی نہایت فطری اور روشن تفسیر کی حامل ہیں لیکن یہ حقیقت ہمیں تسلیم کرنی ہو گی کہ اقبال کی شاعری قرآن کی کوئی واضح اور قطعی تعبیر پیش نہیں کر سکی عمر کے آخری برسوں میں " خاتمہ بالخیر " کے خیال سے ان کی سب بڑی خواہش خود قرآن پر تشریحی نوٹ لکھنے کی تھی ۔ اس کے لئے حتی الوسع ضروری مواد بھی جمع کر لیا تھا مگر افسوس کہ ضعف بصارت اور دیگر عوارض جسمانی اور سب سے بڑھ کر موت نے انھیں اس کار عظیم کو ہاتھ لگانے کی مہلت نہ دی اور وہ اس پاک ارادے کو سینے میں دبائے اپنے ساتھ قبر میں لے گئے ۔ ورنہ قرآن کی تعلیمات اقبال کے واضح تر الفاظ میں محفوظ ہو جاتیں ۔

فٹ نوٹ:

(۱) امام رازی کی تصنیف الہیات و طبیعیات کے متعلق۔

(۲) ۔ راقم نے اس کتاب کا ایک نسخہ ۱۹۴۶ء میں پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں دیکھا تھا ۔ تصنیف و طباعت حافظہ سے اتر گیا ہے شاید بیسویں ۔ صدی کے آغاز میں چھپی تھی

اقبال اور لسان العصر اکبر

(۱)

علامہ اقبال لسان العصر اکبر سے اول اول " مخزن " کے ذریعے سے متعارف ہوئے تھے یہ زمانہ بر عظیم ہند میں مسلمانوں کے لئے بڑا مایوس کن اور حوصلہ شکن تھا ۔ انگریزی راج کی " برکتیں " رنگ لا رہی تھیں ۔ اس عہد کے خد و خال واضح کرنے کے لئے صرف مولانا حسرت موہانی کا نام لینا ہی کافی ہے ۔ بظاہر وہ سرسید کے کالج سے نکلے تھے جس کی بنیاد ہی مصالحت پر رکھی گئی تھی لیکن حسرت کی طبیعت رضا جویانہ نہیں باغیانہ تھی ۔ انہوں نے انگریزی اقتدار کی رو میں بہ جانے سے انکار کر دیا ۔ ایسے من چلے کم دیکھنے میں آتے ہیں بعض بزرگ ایسے بھی تھے جن کا رویہ بظاہر صلح جویانہ تھا لیکن ان کے دل مغربیت کے مقابلے میں مشرقیت کو زندہ رکھنا اور دیکھنا چاہتے تھے ۔ اسی گروہ میں مدیر " مخزن " شیخ عبد القادر مرحوم بھی شامل تھے ، جنہوں نے " مخزن" جاری کرکے اپنی مشرقیت پسندی کا ثبوت دیا ۔ اس پر فتن دور میں بس " مخزن" کے صفحات ہی سکون کا ایک گوشہ پیش کرتے ہیں جہاں ہمارے لکھنے والے بزم خیال میں مل بیٹھتے تھے اور دل کے بہلانے کو یہ سمجھتے تھے کہ زندگی بظاہر جتنی پر آزمائش اور مشکل نظر آتی ہے دراصل ویسی نہیں ہے بلکہ مقابلہ آسان ہے " مخزن " کا حلقہ وسیع تھا اس نے صرف مسلمانوں ہی کے لئے اپنی آغوش وانہیں کر رکھی تھی بلکہ بعض ہندو لکھنے والوں کو بھی اس میں جگہ دی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم " مخزن " کو محض ایک مجلہ نہیں بلکہ ایک باقاعدہ تحریک

خیال کرتے ہیں ۔ ایک ایسی تحریک جس نے خاص طور پر شمال مغربی ہندوستان میں یہاں کی چشم بینا کو علمی ، ادبی اور ثقافتی ادبار کی تاریکی میں روشنی کی کرن دکھائی تھی ۔

لسان العصر اکبر اس روشنی کی کرن سے بظاہر بہت دور تھے اور تعجب ہوتا ہے کہ وہ قریب تر روشنی کی مشعلوں کو نظر انداز کرکے کن اسباب کی بنا پر ایک دور دراز مقام سے نکلنے والی کرن کی طرف لپکے ۔ اس کے دو ہی وجوہ ہو سکتے ہیں ۔ اول یہ کہ روشنی کی یہ کرن ہی اتنی تابناک اور زود رس تھی کہ بستر علالت پر دراز ، نیم جان ، اونگھتے ہوئے شاعر کی آنکھ میں چکا چوند پیدا کر گئی ، یا پھر مسلسل علالت اور کہولت کے باوجود شاعر کی آنکھ میں اتنا دم تھا اور اس کی نگہ اتنی دور رس تھی کہ وہ خود بخود سینکڑوں میل دور چمکنے والی کرن کی طرف متوجہ ہو گئی اس وقت اس بارے میں کوئی قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے ۔ ذیل کے حقایق کسی نتیجے پر پہنچنے میں شاید ہماری مدد کر سکیں ۔

مولانا اکبر کی شاعری اور اس لئے ان کی زندگی کا بڑا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ قدیم مشرقی تہذیبی اور تمدنی اقدار کو برقرار رکھنے کے لئے کسی مخالف یا متبادل چیز کو پاؤں جمانے کا موقع ہی نہ دینا چاہتے تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر اس نئی بات ، ہر نئی طرز اور ہر نئی ادا کے ساتھ ٹکر لینے کے لئے تیار ہو گئے جس کے متعلق ان کے دل میں شبہہ گزرتا تھا کہ یہ قدیم روایات کو کسی پہلو سے بھی مسخ کر سکتی ہے یا بالآخر ان کی جگہ لینے میں کامیاب ہو سکتی ہے ۔ اس سلسلے میں سرسید مرحوم کے کالج سے لیکر کپڑے کی دلائتی کاٹ تک کوئی قابل اعتنا چیز ان کی طنزیہ تنقید سے نہ بچ سکی ۔ (۱) اس حقیقت کے باوجود کہ خود اکبر انگریز کی نوکری کرتے تھے ، اپنے بچوں کو مغربی تعلیم دلواتے تھے اور جی کھول کر رندی کرتے اور داد عشرت دیتے تھے ، ان کے

خیال میں سرسید کا کالج مغرب کی لائی ہوئی خرافات اور الحاد کا سر چشمہ تھا۔ اکبر کی نصف سے زیادہ شاعری صرف اس بہانے سے وجود میں آگئی کہ وہ کالج کی بنیادوں کو اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے۔ کالج سے زیادہ انہوں نے سرسید کا نام لے کر طنزیہ شعر کہے مگر یہ خیال اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ وہ سرسید کی ذات کو ہدف ملامت نہیں بناتے تھے بلکہ اس تحریک کا مضحکہ اڑاتے تھے جو سرسید کے سراپا میں کار فرما تھی۔ ہندی مسلمانوں کی تاریخ میں " سرسید احمد خان " کا نام محض کسی شخص کے نام کے طور پر نہیں بلکہ ایک نہایت ہمہ گیر اور جامع تحریک کے لئے علامت کی حیثیت سے استعمال ہو گا اکبر کا شعر اسی تحریک کے تار و پود بکھیرنے کے لئے وجود میں آیا تھا اس موقع پر اگر اس خیال کا اظہار کر دیا جائے کہ مولانا شبلی کو کالج سے علیحدہ کرنے میں اس شعر کو بھی کچھ نہ کچھ دخل تھا تو غالباً بے جا نہ ہو گا۔ دراصل اکبر کے شعر نے نہ صرف شبلی کو کالج سے فارغ کرنے میں حصہ لیا بلکہ بعض دوسرے لوگوں کو کالج کی تحریک میں شرکت کرنے سے بھی باز رکھا ان واقعاتِ کی بنا پر اگر اکبر کے کلیات میں سے سرسید اور کالج کے دو الفاظ نکال دیئے جائیں تو باقی ماندہ شاعری پھیکی اور بے نمک رہ جائیگی۔

ان باتوں کو ذہن میں رکھ کر مخزن اور مخزن میں لکھنے والوں سے اکبر کے خوشگوار تعلقات اور بعض دوسرے اہل قلم سے ان کے بزرگانہ یا نیاز مندانہ روابط کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، اکبر قدیم وضع اور روایات کے عاشق تھے اور ہر اس شخص کے پرستار جس کے دل میں قدیم وضع اور روایات کا احترام موجود پاتے تھے۔ میں نے اوپر " نیاز مندانہ " کا لفظ بے سوچے سمجھے نہیں لکھا حقیقت یہ ہے کہ اکبر مشرقی روایات کی پاسداری کرنے والے اور مشرقی اقدار و خیالات کا لحاظ رکھنے والے ہر شخص سے

عمر کے تفاوت کے باوجود نیاز مندانہ روابط قائم رکھنے میں فخر محسوس کرتے تھے مثلاً مولوی عبدالماجد صاحب کے نام اکبر مرحوم کے جو مکاتیب " خطوط مشاہیر میں چھپے ہیں ، ان میں بکثرت شواہد ملتے ہیں کہاں ستر برس کا جہاں دیدہ رمز شناس ، مشاق شاعر اور کہاں ۲۴ ، ۲۵ برس کا " فلسفی قسم کا دہری (۲) " مسٹر عبد الماجد لیکن ان خطوط میں بہت سے مقامات پر یوں اظہار خیال کیا ہے :

" میں تو آپ سے ملنے کا بہت مشتاق رہتا تھا بہت سے امور ہیں جن پر آپ کی توجہ رجوع کروں اور اپنی تسکین کے لئے آپ سے اظہار خیال چاہوں " (ص ۴۵) ایک خط میں مسٹر عبدالماجد نے بعض علمی انگریزی اصطلاحوں کے مناسب اردو ترجمے دریافت کئے تو ان کو لکھا " کتابیں بند پڑی ہیں اور بے ترتیب ہیں کچھ مدد نہ لے سکا ۔ درد سر سے پریشان ہوں میں آپ کے مشاغل اور عادات اور حالات سے آگاہ نہیں ہوں ۔ لہذا اس لکھنے کی جرات نہ کر سکا کہ دو چار دن کو یہیں تشریف لائیے ۔ خدا آپ کو ترقیات ظاہری و باطنی عطا کرے اور اس مصرع کے مصداق ہوں :

(ص ۵۲)

ع : ستارہ بدرخشید و ماہ مجلس شد "

ایک اور خط میں ہے " مجھ کو تو آپ کا خادم اور دعا گو رہنا چاہیئے " یہ صرف جستہ جستہ مثالیں ہیں ورنہ مولوی عبدالماجد صاحب کے نام کوئی ۲۰۰ مکاتیب ایسی ہی منکسر المزاجی اور نیاز مندی کے جذبات سے بھرے پڑے ہیں یہ مکاتیب ایسے حالات میں لکھے گئے تھے جب کہ مولوی صاحب موصوف بقول خود دہریت اور الحاد میں ڈوبے ہوئے تھے اور سلامتی کا کنارہ ابھی آنکھوں سے اوجھل تھا گویا یہ خطوط محض خوش گمانی کی بنا پر لکھے گئے ، اس امید پر کہ یہ ہونہار نوجوان بہت جلد ماسوا سے منہ موڑ لے گا ۔ ورنہ انھیں مولوی صاحب

کے فلسفے کی کوفت میں ایک دفعہ انہوں نے فرمایا تھا:

مسجد میں شیخ صاحب گرجا میں لاٹ صاحب
بدھو فلاسفی کے کمرے میں سڑ رہے ہیں
خاک اڑ رہی ہے گھر میں ڈیوڑھی میں غل مچا ہے
مذہب کے ہیں مخالف بھائی سے لڑ رہے ہیں

یقیناً یہ مولانا اکبر کے نیاز مندانہ رویہ کا اثر تھا کہ بالآخر مولوی عبدالماجد صاحب دہری فلسفے کی راہ سے ہٹ کر الہیات کی طرف متوجہ ہو گئے

یہ نیاز مندی کا معاملہ صرف مولوی عبدالماجد ہی کے ساتھ نہ تھا۔ سید سلیمان ، سرعبدالقادر اور دیگر مشرق پسند بزرگوں کے نام کے خطوط سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے یہ حضرات عمر میں حضرت اکبر سے بہت چھوٹے تھے مگر خطوط میں اکبر کی منکسر المزاجی نے خود اکبر کو چھوٹا اور عقیدت کیش بنا کر دکھایا ہے مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی سے اکبر کے تعلقات کی نوعیت زیادہ واضح نہیں ہے ، جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ دونوں کالج سے وابستہ رہ چکے تھے اور مغرب اور گاندھی کے ساتھ ان کے روابط بڑھ رہے تھے (۳) ۔ ۱۴ جنوری ۱۹۲۰ء کو مولوی عبدالماجد صاحب کے نام ایک خط میں لکھا ہے "سعدی علیہ الرحمتہ" فرماتے ہیں:

ہرگز حسد نبردم بر منصب و مالے
الا براں کہ دارد با دلبرے وصالے

مجھ کو کسی کے جاہ و دولت پر حسد نہیں ہوتا لیکن محبوب داستاں سے جس کو وصل ہوتا ہے اس پر ضرور رشک و حسد ہوتا ہے علی برادرز کا معاملہ تو غربی کرشمہ ہے ۔ لیکن حضرت سید سلیمان ندوی سے آپ کے ملنے پر رشک آتا

ہے ۔ میں اس صحبت سے محروم رہتا ہوں " (ص ۱۸۱) اسی خط میں آگے چل کر لکھا ہے " علی برادرز کی رہائی پر خوشی کا ایک پہلو تو یہ بھی ہے کہ انگریز اپنی فتح پر مطمئن ہو گئے اور اس کی ضرورت نہ رہی کہ اپنے نامہربانوں کو محبوس رکھیں لیکن میں تو صرف اس امید سے خوش ہو سکتا ہوں کہ برادران ممدوح مسلمانوں کی روحانی اور اخلاقی ترقی میں بدل توجہ فرمائیں گے " ۔ (ص ۱۸۲)

اکبر کے میلان طبع کے بارے میں ان حقائق پر نظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مخزن کی مشرقیت نے ایک بڑا کام یہ کیا کہ " مدیر مخزن کے لئے مولانا اکبر کے دل میں ایک مستقل جگہ پیدا کر دی ۔ ۲۱ جون ۱۹۱۰ء کو شیخ صاحب کے نام مولانا کا لکھا ہوا ایک خط ان دو شعروں سے شروع ہوتا ہے :

(۱)

کوئی ذرہ تو اس کا تا بہ دامن اڑ کے پہنچے گا
یہ مشت خاک تیری راہ میں برباد کرتے ہیں
(آتش)

(۲)

کوئی تو ان میں کا پہنچے گا اس دست مبارک تک
یہ دو اک کارڈ اس کی راہ میں برباد کرتے ہیں
(اکبر)

مدیر مخزن سے اکبر کے نیاز مندانہ تعلقات کا ان اشعار سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے ادھر سے مخزن نے کوئی کم قدر شناسی نہیں کی سید اکبر حسین کو لسان العصر (۴) بنا دیا ۔

" مخزن " نے دوسرا بڑا کام یہ کیا کہ علامہ اقبال کو لسان العصر سے غائبانہ طور پر متعارف کرا دیا ۔ متعارف ہونے کی تاریخ کا کھوج لگانا تو شاید

مشکل ہے ، البتہ اتنی بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ولایت جانے سے پہلے اقبال کی شاعری کا چرچا مولانا اکبر کے کانوں تک پہنچ چکا تھا ولایت سے لوٹنے کے بعد راہ و رسم پیدا ہو گئی اور رابطہ بڑھ گیا اور بنارس کے لنگڑے آم جو سر عبدالقادر کو الہ آباد سے ہر سال وصول ہوتے تھے ، اب اقبال کو بھی ملنے لگے کسی ایسے ہی موقع پر آموں کا تحفہ موصول ہونے پر اقبال نے لسان العصر کو یہ شعر لکھ کر بھیجا تھا :

اثر یہ تیرے اعجاز مسیحائی کا ہے اکبر
الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا

اس وقت دونوں طرف سے باقاعدہ خط و کتابت شروع ہو چکی تھی ، اقبال رو در رو ملاقات کے لئے بے قرار تھے مگر بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ دسمبر ۱۹۱۱ء سے پہلے انھیں حضرت اکبر سے شرف ملاقات حاصل نہ ہو سکا ۔ ۶ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو مولانا اکبر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

میں آپ کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے اور وہی محبت و عقیدت اپنے دل میں رکھتا ہوں ۔ خدا کرے وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرف نیاز حاصل ہو اور میں اپنے دل کو چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں ۔ لاہور ایک بڑا شہر ہے لیکن میں اس ہجوم میں تنہا ہوں ایک فرد واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے :

طعنہ زن ہے ضبط اور لذت بڑی افشا میں ہے
ہے کوئی مشکل سی مشکل رازداں کے واسطے

لارڈ بیکن کہتے ہیں : " جتنا بڑا شہر ہو ، اتنی ہی بڑی تنہائی ہوتی ہے " سو یہی حال میرا لاہور میں ہے " ۔ (۵)

اسی خط میں اپنی نظم غزہ شوال کا ذکر کیا ہے جو زمیندار (لاہور) کے عید نمبر میں شائع ہوئی تھی اور لکھا ہے " اس کو ضرور ملاحظہ فرمائیے "۔

لسان العصر نے اس خط کے جواب میں جو مکتوب لکھا وہ خوش قسمتی سے محفوظ ہے ۔ اسے لاہور کے ایک ہفتہ وار اخبار " شیرازہ " نے اپنے اقبال نمبر میں درج کیا تھا اس کا ضروری حصہ جو سیرت اقبال میں نقل ہوا ہے حسب ذیل ہے :

" آپ کی نظم میں نے پڑھی ، ماشاء اللہ چشم بد دور ، بعض اور بزرگوار بھی تھے سب نے نہایت تعریف کی منشی صاحب نے تو نقل مانگی ہے لیکن مجھ پر بہت اثر ہوا وہ اثر باعث سکون خاطر ہے میں افسوس کرتا تھا اور صرف ایک آپ کے ہونے سے وہ افسوس کم نہیں ہوا کہ قوم کیوں بے بصیرت ہو گئی ہے ۔ اگر جان کو قوت نہیں پہنچا سکتی تو تدبیر ہلاکت کی کیوں موید ہے ۔۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو چشم بصیرت عطا فرمائی ہے کہ اس عمر میں بلاتجربہ دنیا آپ کے دل کی نظر کم سے کم اخلاقی حقایق کی طرف ہے :

ع : کافروں کی مسلم آئینی کا نظارہ بھی کر

کس قدر بلیغ و صحیح و لبریز معنی ہے ۔ اگرچہ یہ لطیف و خوبصورت و بلیغ ترکیب الفاظ آپ کی علمی قابلیت اور خاص شاعرانہ سلیقہ کا نتیجہ ہے لیکن یہ خیال مرتب و با وقعت ہو کر کس کے دماغ کو نصیب ہوتا ہے " گرم گفتاری اور خود داری " کے قوافی بھی حقائق کے مضامین سے مزین ہیں " شکست رشتہ تسبیح اور پختہ زناری " آپ کا حصہ ہے الغرض جملہ اشعار لاجواب ہیں ۔ میری مدح سے بجز اس کے کہ آپ خوش ہوں اور کچھ ہونا نہیں ہے ۔ اگرچہ یہ بھی بہت ہے لیکن کبھی آپ سے ملاقات ہو اور زبانی گفتگو ان

اشعار کے معانی پر ہو تو گونا گوں فوائد حاصل ہو سکتے ہیں ۔ جو آئندہ طریق عمل کے لئے کار آمد ہوں ۔۔۔۔۔۔

اس خط کے بعد جلد ہی لسان العصر نے ایک دوسرا خط اقبال کو لکھا ۔ علامہ نے اپنے ۹ نومبر ۱۹۱۱ء کے خط میں دونوں کی رسید کی اطلاع دی ہے اور ملاقات کے لئے بے قراری کا اظہار کیا ہے ۔ "آپ کی ملاقات کے لئے دل تڑپ رہا ہے ۔ خدا جلد کوئی سامان پیدا کرے ۔ کیا آپ دربار کے موقع پر دہلی تشریف لائیں گے " ۔ اس سے ذرا اوپر مولانا کے "نوازش ناموں" سے گہرے قلبی تعلق کا اظہار کیا ہے ۔ قومی جلسوں سے بھی پہلو تہی کرتا ہوں ۔ ہاں آپ کے خطوط جو میرے پاس سب محفوظ ہیں بار بار پڑھا کرتا ہوں اور تنہائی میں یہی خاموش کاغذ میرے ندیم ہوتے ہیں " ۔ خط کے آخری حصے میں مولانا کے چھوٹے صاحبزادے میاں ہاشم کو پیار بھیجا ہے "ہاشم طال عمرہٗ کو میری طرف سے بہت بہت پیار کیجیئے ۔ میری روح کو اس نام سے ایک خاص تعلق ہے ۔ اللہ تعالیٰ اس بچے کی عمر دراز کرے اور دین و دنیا میں اسے بامراد کرے ۔ سکول کی خواندگی میں اس کا وقت ضرور ضائع ہوتا ہو گا مگر باوجود اس کے کس قدر خوش نصیب لڑکا ہے کہ پیران شرق سے فیض کی نظر لے رہا ہے یہی نظر صبغتہ اللہ ہے ۔ اب کوئی دن جاتا ہے کہ پیران مشرقی دنیا میں نہ رہیں گے اور آئندہ زمانے کے مسلمان بچے نہایت بدنصیب ہوں گے " ۔

افسوس ہے کہ یہ لڑکا ابھی پوری طرح جوان بھی نہ ہوا تھا کہ بڈھے باپ کو داغ مفارقت دے گیا ۔

نومبر ۱۹۱۱ء سے جولائی ۱۹۱۴ء تک لسان العصر کے نام اقبال کا کوئی خط غالباً محفوظ نہیں ہے ۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اقبال مغرب کی مادہ پرستی کے آنکھوں دیکھے مائل بانتشار احوال سے یکسر متنفر ہو کر "پیران مشرقی" کے

فیض سے زیادہ سے زیادہ مستفیض ہونے کی کوشش کر رہے تھے ۔ ایک طرف مغز قسم کے صوفیانہ عقاید اور مشاغل نے ان کے ذہن میں حشر بپا کر رکھا تھا اور وہ دل ہی دل میں ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے منصوبے باندھ رہے تھے تو دوسری طرف ان کی طبعی روحانیت پسندی انھیں بعض صاحب دل بزرگوں کے زیادہ سے زیادہ قریب لا رہی تھی لسان العصر اکبر بھی انہی بزرگوں میں شامل تھے اس زمانے میں اقبال ایک سے زیادہ مرتبہ بڑے ذوق و شوق کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ مولوی عبدالماجد صاحب کے نام بعض خطوں میں ان عقیدت مندانہ ملاقاتوں کا ذکر موجود ہے ۔

ان دنوں اقبال نے اکبری رنگ میں بعض طنزیہ اشعار کہے تھے ۔ گویا شاعر نے شاعرانہ انداز میں شاعر کو داد دی تھی یہ اشعار لوگوں کو شاید اس وجہ سے پسند نہ آئے کہ ان میں مخصوص اکبری رنگ نکھر نہ سکا اور یہ اشعار خود اقبال کی شہرت کے منافی ثابت ہوئے بعض اہل قلم نے اس واقعے کو ہوا دی اور لسان العصر کی مدح و تعریف کے پردے میں اقبال کو "پوچ گو" ثابت کیا ۱۶ جولائی ۱۹۱۴ء کا اکبر کے نام اقبال کا خط نیاز کیشانہ جذبات سے بھرا ہوا ہے اس خط میں اقبال نے مندرجہ ناگوار واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت اکبر کے ساتھ گہری ارادت اور عقیدت کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ " انشاء اللہ جب تک میں زندہ ہوں یہ ایسی ہی رہے گی " ۔ خط کے آخر میں اکبر کے مصرع " غم بڑا مدرک حقایق ہے " کی داد دی ہے کہ " زندگی کا سارا فلسفہ اس ذرا سے مصرع میں مخفی ہے " ۔

دسمبر ۱۹۱۴ء میں دوسرا خط لکھا ۔ اس میں جناب اکبر کے شعر:

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے ، عقل ، عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

کی دل کھول کر داد دی ہے " ۔ سبحان اللہ ! کس قدر باریک اور گہرا شعر ہے ۔۔۔۔۔۔ ہیگل کا تمام فلسفہ اس اصول پر مبنی ہے ۔ آپ نے ہیگل کے سمندر کو ایک قطرے میں بند کر دیا ۔ یا یوں کہیے کہ ہیگل کا سمندر اس قطرے کی تفسیر ہے " ۔ پھر لکھا ہے ۔

" کیمبرج کی تاریخ ہندوستان کے لئے جو مضمون اردو لٹریچر پر مجھے لکھنا ہے ، اس میں اس شعر کا ضرور ذکر کرونگا " ۔

انہی دنوں اکبر نے مولوی عبدالماجد صاحب کو خط لکھا تو ڈاکٹر اقبال کی داد شعر کا اس میں ذکر کیا ۔ " جب میں نے یہ شعر کہا اور اس کی داد ڈاکٹر اقبال صاحب نے دی ، اس وقت تک مجھے خبر نہ تھی کہ ہیگل نے اس خیال کو وسعت دی ہے لیکن فلسفہ ہے کیا ؟ نتیجہ غور و فکر کا " ۔

لسان العصر خود جان پر سوز اور دل گداختہ رکھتے تھے جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا ان کی طبیعت کا بڑا خاصہ مشرقی روحانیت پسندی تھا ۔ اسی وجہ سے خواجہ حسن نظامی صاحب کے ساتھ باوجود تفاوت عمر کے ان کے مراسم مریدانہ رہے اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر بھی ایک عرصے مقیم رہے ۔ اس طبعی خاصے کی بنا پر وہ ہر اس شخص کے ساتھ والہانہ تعلقات قائم کرنے میں سبقت کرتے تھے جسے وہ مشرقی روحانیت کی طرف مائل پاتے تھے ۔ ۱۴-۱۹۱۳ء کے قریب ایک تو مسلسل علالت کے سبب سے اور دوسرے بے حد عزیز جوان بیٹے کے انتقال کی وجہ سے وہ دنیا سے دل برداشتہ ہو چکے تھے پھر انہیں اپنی شاعری کے مشن میں بھی ناکامی اور شکست نظر آرہی تھی اس لئے قدرتی طور پر انہیں ایک ایسے جانشین کی ضرورت محسوس ہوئی جو ان کے کام کو سنبھال سکے اور اس اہم مگر مشکل کام کو جاری رکھ سکے ۔ اچانک ان کی مصروف جستجو نگاہ اقبال پر جا کر تھم گئی اقبال میں لسان العصر کو نہ صرف یہ

کہ اپنے مقصد کو سہارا دینے والا ملا بلکہ یہاں انہیں ایک ایسی پر زور اور فعال شخصیت نظر آئی جو ان کے محبوب مقصد کو زیادہ جوش اور قوت کے ساتھ آگے بڑھا سکتی تھی ۔ ذیل کے خط سے انہی جذبات اور توقعات کا اظہار ہوتا ہے : ۔

"۔۔۔۔ میں نہ کمیٹی کا مشتاق ہوں نہ بڑے لوگوں کا اب تو شکستہ حالی اب کیا ہمیشہ دل کے لئے شکستہ حالی اچھی ہے آب رواں الٰہی کا درخت قمری کی آواز ، جنگل کا سماں ، مسجد کا صحن ، بہت زیادہ دلکش ہے ، نصیب نہیں ہوتا ہاں آپ سے ملنے کا بہت آرزو مند ہوں :

امانت عشق کی بعد اپنے کیا جانیں ملے کس کو
نہیں معلوم جائے کس کے سر یہ درد سر اپنا

مدت کا پرانا شعر ہے ۔ دیکھا کہ وہ بار غم جو میرے دل پر مستولی تھا ، آپ کے دل نے اٹھا لیا ، وہی درد تھا ، وہی سمجھ اور بصیرت تھی جس نے آپ کے قلم سے قوم فروش کی طعن تر شوادی یوں تو ہر شخص کے خیالات علیحدہ ہوتے ہیں اور آپ تو ماشاء اللہ ابھی کم عمر ہیں ، آپ کو بہت کچھ کرنا ہے ۔۔ ۔ میرے اشارات بڑی تفصیل چاہتے ہیں ۔ آپ کبھی ملیں تو مجھ کو یقیناً بڑی روحانی مسرت ہو گی لیکن آپ کو بھی بہت سی باتوں پر توجہ ہو جائے گی حسن نظامی کی تحریر سے آپ کی مشغولی طاعت و قرآن خوانی کا ذکر دریافت کرکے خوش ہوا وکذالک جلعلناکم امتہ وسطاً لتکونوا شھداً علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا پس آپ شہدا علی الناس میں داخل ہیں یا انشاء اللہ داخل ہو جائیں گے میرے حق میں بھی دعا فرماتے رہیے ۔۔۔ جب قوم تھی تو سب کچھ کہہ سکتے تھے خیر جو کچھ ہوا ، اب آپ کے سپرد چارج ہے ہم تو آپ کی ملاقات کی مسرت مول لینے پر مستعد ہیں آپ کا مصرع

"در گرہ ہنگامہ داری چوں سپند"

ہم کو ہمیشہ یاد رہتا ہے بیدل نے کہا:

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو و سمن در آ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدہ در دل کشا بہ چمن در آ

لیکن آپ کا مصرع بلیغ تر ہے، آپ نہ مانیں تو میں توضیح کر دوں گا"

اکبر اگر (بفرض محال) اس وقت رحلت کر جاتے تو ان کی بے چین، مصروف عمل اور رہین کشمکش روح کو ہمیشہ کے لئے اطمینان نصیب ہو جاتا۔ لیکن انہیں ان کی قسمت میں ابھی اور پیچ و تاب کھانا اور تڑپنا لکھا تھا۔ لسان العصر نے ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو وفات پائی تو ان کی روح ویسی ہی بے چین مصروف عمل اور رہین کشمکش تھی اس اجمال کی تفصیل آگے آتی ہے۔

۱۹۱۵ء اس اعتبار سے بڑا اہم سال تھا کہ اس میں پروفیسر آین سٹائن نے رائج الوقت سائنسی اور خاص طور پر طبیعی مسلّموں پر اپنے عام انکشاف اضافیت سے شاید آخری ضرب لگا دی۔ دوسری طرف پہلی جنگ عظیم اپنی ہولناکیوں کے بل بوتے پر اہل مغرب کی قابل فخر تہذیب کو ملیامیٹ کرنے میں مصروف تھی اور یہاں برعظیم ہندو پاک میں اس سال ایک رند سیرت مگر قلندر صفت مرد خود آگاہ نے اپنی انقلابی کتاب "اسرار خودی" کی تصنیف سے بعض مروجہ اور مسلمہ صوفیانہ عقاید اور مشاغل کو متزلزل کرکے رکھ دیا۔ اس ضمن میں اقبال نے خواجہ حافظ شیرازی کا بھی نام لیا اور ان کے کلام کے متعلق یہ رائے قائم کی کہ وہ افراد اور قوموں کے اخلاق پر گمراہ کن اثرات ڈالتا ہے (۶) اس کے ساتھ ہی مصنف نے مخصوص خودی کا فلسفہ پیش کیا اور اس لفظ کو بالکل الگ اور منفرد معنی پہنائے اور ثابت کیا کہ خودی کی تربیت کی

راہ میں گوسفندی فلسفہ اور تصوف (جس کے خواجہ حافظ مبلغ تھے) بری طرح حارج ہوتا ہے ۔ لہذا زندگی کی متمنی قوموں کو خواجہ حافظ کے کلام سے ہوشیار رہنا چاہیے ۔

اکبر کے نام علامہ اقبال کا سب سے پہلا خط جس میں مثنوی کی تصنیف کا ذکر ہے ، ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو لکھا گیا تھا ۔ اس خط میں علامہ نے امامت کے اصول پر رائے زنی کی ہے اور بتایا ہے کہ اس اصول کا ایک نقص یہ ہے کہ " عوام کو مجتہدین ہی سے تعلق رہتا ہے اور قرآن سے تعلق کم ہوتا جاتا ہے ۔ یہاں تک کہ بالکل کوئی تعلق نہیں رہتا " پھر فرمایا ہے " مذہب بغیر قوت کے محض ایک فلسفہ ہے ۔ یہ نہایت صحیح مسئلہ ہے اور حقیقت میں مثنوی لکھنے کے لئے یہی خیال محرک ہوا " ۔ آخر میں چند اشعار درج کئے ہیں جن میں سے بعض کچھ تغیر کے ساتھ پیام مشرق میں نظر آتے ہیں ۔ ان لفظی تغیرات کا مطالعہ بعض صورتوں میں نہایت دلچسپ ہے ۔

اس کے بعد دوسرا خط صرف ایک ہفتے کے بعد لکھا گیا ۔ اس میں بھی علامہ نے صوفیاء کی دکانوں کا دکھڑا رویا ہے ۔ " صوفیاء کی دکانیں ہیں مگر وہاں سیرت اسلامی کی متاع نہیں بکتی " پھر علماء اور صوفیاء میں طاقت کے لئے جنگ کا ذکر کیا ہے اور مجدد الف ثانیؒ عالمگیرؒ اور مولانا اسمعیل شہیدؒ کی اسلامی سیرت کے لئے مساعی کا تذکرہ کیا ہے اور کہا ہے کہ : " صوفیاء کی کثرت اور صدیوں کی جمع شدہ قوت نے اس گروہ احرار کو کامیاب نہ ہونے دیا " ۔

(مکاتیب جلد دوم ص ۴۸)

معلوم ہوتا ہے کہ اول اول ۱۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کے قریب مثنوی " اسرار خودی " اکبر کی نظر سے گزری ۔ تاثرات مولوی عبدالماجد صاحب کے نام ایک خط میں لکھے ہیں " دو نئی تصنیفیں نظر سے گزریں ایک معارج الدین (۷)

دوسری مثنوی " اسرار خودی " مصنفہ ڈاکٹر اقبال صاحب جس میں مصنف نے کہا ہے کہ اپنی خودی کو مٹانے والا فلسفہ جس کا مشرق پر بہت اثر ہوا صحیح نہیں ہے ۔ خودی کو بڑھانا چاہیے ۔ ۔ ۔ مثنوی کی نسبت تو کچھ زیادہ نہ کہنا چاہیئے کیونکہ وہ مذہبی اور قومی جوش پر مبنی ہے اشعار نہایت اچھے ہیں :

ہست در ہر گوشہ ویرانہ رقص
می کند دیوانہ با دیوانہ رقص

یہ خودی ہستی اور تصوف ہے دیباچے میں پولیٹیکل دانشمندی بھی ہے "

(خطوط مشاہیر ص ۸۲)

یہاں حضرت لسان العصر کے مخصوص صوفیانہ نظریئے کا ذکر مفید ہو گا آپ وحدت الوجودی تھے اور زندگی کی وحدت کے بڑے پر زور حامی ۔ اس کے متعدد شواہد ان کے کلام میں موجود ہیں ۔ مثال کے طور پر ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں مولوی عبدالماجد صاحب کو لکھتے ہیں :

نہ حدوں کا یاں ہے نشاں کہیں ، نہ محل حرف و بیاں کہیں
مرا عشق ہے ترا حسن ہے مری آنکھ ہے تری شان ہے

مجھ کو اپنا ایک اور شعر یاد آیا جو وحدت زندگانی کے متعلق ہے :

میرے اس مصرع پر سب کی واہ ہے
ہوش میں ہوں زندگی اللہ ہے

یہ شعر بھی وہی پہلو لئے ہوئے ہے :

یہ جتنے ذرے جہان فانی کے اتنی شکلوں میں جلوہ گر ہیں
خدا کی ہستی کے سب ہیں شاہد اور اپنی ہستی سے بیخبر ہیں

ایک دوسرے خط میں زیادہ صاف طور پر اپنے ہمہ اوستی عقیدے کا

اظہار کیا ہے ۔ " جب غور کرو ، اور حقیقت پر نظر ڈالو ، تو کل پر فنا حاوی ہو جاتی ہے ۔ صرف علم باری رہ جاتا ہے ہمہ اوست ہمیں سے ہے " ۔

(ص ۱۵۵)

فٹ نوٹ:

(۱) ۔ ایک دفعہ " بائیسکل " کے لفظ کا تجزیہ کرکے اسے " مجسم روگ " ثابت کیا تھا ۔ بزم اکبر میں پورا واقعہ درج ہے ۔

(۲) ۔ یہ مولانا کے اپنے الفاظ ہیں ۔

(۳) ۔ یہ شعر مولانا محمد علی جوہری کے متعلق کہا تھا :

بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں
گو مشت خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

(راقم)

الحمراء : یہ شعر غالباً مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی شان میں کہا گیا تھا ۔ علاوہ ازیں محمد علی کے تعلقات مغرب سے بڑھ نہیں رہے تھے روز بروز کم ہو رہے تھے ۔

(۴) ۔ یہ لقب میر نیرنگ نے مخزن کے ذریعہ مولانا کے لئے تجویز کیا تھا ۔

(راقم)

(۵) ۔ مکاتیب حصہ دوم ص ۳۵ ۔

(۶) ۔ زیادہ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم کا مضمون " اسرار خودی کی اشاعت کے بعد" مطبوعہ الحمراء ستمبر ۱۹۵۱ء

(۷) ۔ تصنیف مولوی نواب دین ایم ۔ اے ۔

(۲)

حضرت اکبر صوفی اور پکے صوفی ہونے کی وجہ سے صوفی شعرا کے خاص طور پر معتقد تھے ۔ بالخصوص خواجہ حافظ شیرازی سے ان کی والہانہ عقیدت کا حال کلیات اکبر پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے ۔ انھوں نے اکثر فارسی صوفی شعرا کے دلپسند اشعار پر تضمینیں لکھی ہیں لیکن جس بڑی تعداد میں خواجہ حافظ کے اشعار پر تضمینیں کلیات میں نظر سے گزرتی ہیں اور کسی شاعر کے کلام پر نہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خواجہ حافظ کو دل سے لسان الغیب جانتے تھے اور ان کے دیوان کو بھی اسی نظر سے دیکھتے تھے ۔

اب ذرا غور فرمایئے کہ حضرت اکبر نے جب اسرار خودی میں خواجہ حافظ کے متعلق اس قسم کے مصرعے دیکھے ہوں گے :

ہوشیار از حافظ صہبا گسار
زندہ از صحبت حافظ گریز

اور

تو ان پر کیا کچھ نہ گزری ہو گی ۔ وہ یقیناً دل مسوس کر رہ گئے ہوں گے پھر یہ ساری آفت کسی غیر کی نہیں بلکہ ان کے اپنے ممدوح غم گسار اور مونس کی لائی ہوئی تھی ۔ محبوب بیوی اور سید ہاشم کی وفات نے بڑھاپے میں ان کے دل پر چرکے پر چرکا لگایا تھا تو " اسرار خودی " کے ان اشعار نے آخری وار کیا جو زیادہ کاری ثابت ہوا اور اس زخم سے اکبر آخر دم تک تڑپتے رہے ۔

مولانا اکبر کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ قومی درد سے مجبور ہو کر واویلا نہیں کرتے تھے بلکہ دل کی جلن کو ایسے لطیف طنزیہ انداز میں ڈھال

کر پیش کرتے تھے کہ سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا اور اس کا ذہن جلے ہوئے دل کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے اصل محرک کی طرف کھچ جاتا اور اس کی اصلاح کی تدبیر کرتا یہی ان کے شعر کا کمال تھا " اسرار خودی " کے رد عمل کے طور پر انھوں نے یہی طرز عمل اختیار کیا لیکن کھلے بندوں نہیں یہاں انھیں اپنے ممدوح ستودہ صفات کا ادب ملحوظ خاطر تھا ۔ ذیل میں وہ اشعار درج کئے جاتے ہیں جو حضرت اقبال کے متعلق اصلاح حال کی خاطر بعض موقعوں پر لکھے گئے :

مولوی ہو ہی چکے تھے نذر کالج اس سے قبل
خانقاہیں رہ گئی تھیں اب ہے ان کا انہدام
لکچرر مضمون لکھتے ہیں تصوف کے خلاف
الوداع اے ذوق باطن الوداع اے فیض عام

یہاں ان مضامین کی طرف اشارہ ہے جو اقبال نے اسرار کے اشعار کی مزید توضیح کے طور پر بعض رسائل میں چھپوائے تھے :

بنیاد ڈالتے ہیں وہ حکمت کے باغ کی
وسکی سے ہو رہی ہے صفائی دماغ کی
بے بصر وہ ہیں جو بحث میں یہاں خرسند ہیں
جن کی آنکھیں کھل گئیں ان کی زبانیں بند ہیں
تقلید غرب و ترک عبادت پہ ہیں خموش
لے بیٹھے ہیں وہ صوفی خانہ خراب کو
قرآن سمجھ لیں گے ذرا پاس تو ہو لیں
والناس بھی دیکھیں گے ذرا ناس تو ہو لیں
لیڈر کو دیکھتا ہوں تصوف پہ معترض

کالج کے کیڑے پڑ گئے دلق فقیر میں
تمہاری شاعری یہ پھلجھڑی ہے یا پٹاخا ہے
یہ حافظ ہی کی محفل ہے جہاں کاسا دہا قا ہے (۱)
ہاون تو ہے ہوس کا دستہ ہے یا کسی کا
لیکن ادھر تصور جاتا نہیں کسی کا
لکھے گا کلک حسرت مسلم کی ہسٹری میں
اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں
بگذار بحال خودم اے بزم تعلی
عبرت زدہ را کار بہ آزردگاں نیست

مولوی قمر الدین صاحب کی ڈائری میں ایک اور شعر کا ذکر ہے ۔ شان نزول کا درج کر دینا بھی مفید ہو گا اکبر نے فرمایا اقبال کی مثنوی کا یورپ میں ترجمہ ہوا اور اس کی بہت داد دی گئی خیال کرنے کی بات ہے کہ فارسی زبان ایشیائی فلسفہ اور عرفان اور اس کے یورپین قدر دان اس پر اقبال صاحب شادان و فرحان اگر اہل ایران جو اہل زبان ہیں داد دیتے تو ایک امتیازی بات بھی تھی میں اس یورپین ترجمے اور داد کو ہرگز قابل افتخار نہیں سمجھتا میں نے اسی پر کہا ہے:

رقیب سرٹیفکیٹ دیں تو عشق ہو تسلیم
یہی ہے عشق تو اب ترک عاشقی اولیٰ (۲)

یہی شعر شیخ عبدالقادر مرحوم کے نام خط میں درج کیا ہے اور ساتھ یہ شعر بھی لکھا ہے:

طالب ہوں میں تو اپنے ہی دل کی نگاہ کا
سودا نہیں ہے مجھ کو حریفوں کی واہ کا

آخر میں فرمایا ہے میرا مطلع پیش نظر رکھیے:

ع: اور بھی دور فلک ہیں ابھی آنے والے (۳)

یہ تو وہ اشعار ہیں جو وقتاً فوقتاً ان کی زبان بلکہ دل سے نکل گئے ۔ لیکن ان کو عام کرنے سے انھوں نے ہمیشہ احتراز کیا اور ان کو حتی الوسع راز میں رکھا ۔ ان اشعار کے علاوہ کلیات میں اور اشعار بھی ملتے ہیں جو اس سلسلے میں غالباً قابل غور ہیں:

اب ان خطوط کے اقتباس درج کئے جاتے ہیں جو وہ اس دوران میں (۱۹۱۵ء تا وفات) اپنے عزیزوں اور دوستوں کو لکھتے رہے ایسے خطوط کی زیادہ تعداد مولوی عبدالماجد صاحب کے نام ہے (۴) ۔

۶ ۔ اگست ۱۹۱۷ء " حضرت اقبال معلوم نہیں کیوں تصوف کے پیچھے پڑے ہیں " نیوایرا " میں ان کا مضمون چھپا ہے میں فارمل صوفی کبھی نہیں ہوا ۔ نہ قوت نہ ضرورت لیکن اور اٹل فلاسوفی تو عالمگیر مذاق ہے ۔ اسلامیہ تصوف خود کہتا ہے کہ خلاف شریعت کچھ نہ ہو ۔ خیر دنیا کے رنگ ہیں ۔ "

(خطوط مشاہیر صفحہ ۱۲۳)

۱۹ ۔ اگست ۱۹۱۷ء " ۔ ۔ ۔ ۔ جو شخص صرف فلسفے میں پناہ لیتا ہے ۔ اس پر میں زیادہ تعجب نہیں کر سکتا ۔ حیرت تو ان پر زیادہ ہے جو جانشین رسول بن کر اکابر کو گالیاں دینے میں اپنی نمود سمجھتے ہیں ۔ ان میں ہمارے حضرت ۔ ۔ ۔ داخل ہیں تماشا یہ کہ داد طلب کرتے ہیں ۔ آدمی اپنا پوزیشن بھی تو دیکھے ۔ ایک یا چند اشخاص کے کسی ضعیف و مبہم قول کی گرفت کرکے کل سلسلہ تصوف پر جو ایک زبردست اور عالمگیر اور قدیم فلاسوفی ہے ۔ اعتراض کرنا محض رکاکت ہے ۔ اکابر صوفیہ قرآن ہی کے مفسر ہیں " ۔

(صفحہ ۱۲۵)

۲۵ ۔ اگست ۱۹۱۷ء " نیوایرا میں ایک آرٹیکل خواجہ صاحب کے خلاف چھپا تھا اور اقبال صاحب کا ایک مضمون تصوف کے خلاف ۔ اقبال صاحب کی طبیعت نے عجیب تنگ اور بے سود راہ اختیار کی ہے ۔ دیدنی ہے جہان رنگا رنگ "

(صفحہ ۱۲۶)

یکم ستمبر ۱۹۱۷ء " اقبال صاحب کو آج کل تصوف پر حملے کا بڑا شوق ہے کہتے ہیں کہ عجم کی فلاسوفی نے عالم کو خدا اقرار دے رکھا ہے یہ غلط ہے ۔ خلاف اسلام ہے میں نہیں جانتا یہ کیا ترنگ ہے " ۔

(صفحہ ۱۲۸)

" ۱۱ ۔ جون ۱۹۱۸ء " اقبال صاحب نے جب سے حافظ شیراز کو علانیہ برا بھلا کہا ہے ۔ میری نظر میں کھٹک رہے ہیں ۔ ان کی مثنوی اسرار خودی آپ نے دیکھی ہو گی ۔ اب مثنوی رموز بے خودی شایع ہوئی ہے ۔ میں نے نہیں دیکھی ۔ دل نہیں چاہا ۔ خط و کتابت ہے لیکن میں ان کے انقلاب طبیعت سے خوش نہیں ہوں ۔ ہونا اچھا بننا برا ۔ بہرکیف کوئی سیریس معاملہ نہیں ہے ۔ دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے ۔ اور ان روزوں تو طوفان اختلاف برپا ہے :

میں سمجھا تھا براق راہ عرفاں
چو دم برداشتم لیڈر بر آمد " (۵)

۳ ۔ جولائی ۱۹۱۸ء " معلوم نہیں ظفر علی خان صاحب سے سوشل مراسم ہیں یا نہیں میں گمان کرتا ہوں کہ اس مضمون سے وہ کبیدہ ہیں ۔ حالانکہ مجھ کو ان کا خیال مطلق نہ تھا ۔ ان کی رائے بجا اور معتدل تھی شکایت ۔ ۔ ۔ ۔ صاحب سے تھی جنھوں نے پرائیویٹ مراسلت میں کلیتہً طریقت باطنی کی توہین کی تھی (۶) ۔

۱۹۱۸ء کے آغاز کا واقعہ ہے کہ ہندوستان کی اخباری دنیا میں شریعت و طریقت کی بحث چل نکلی شریعت کا جھنڈا دفتر زمیندار لاہور سے بلند ہوا اور طریقت کا دہلی سے (غالباً رین بسیرا سے) شریعت والوں نے حکومت سے مداخلت کی درخواست کی مولانا اکبر نے مصلحت شناسی کی اور اصلاح کے خیال سے "صوفی و ملا" ایک طویل نظم لکھی ۔ چند اشعار درج کئے جاتے ہیں :

اس وقت مولویت صوفی سے بھڑ گئی ہے
اغیار کو ہو مژدہ آپس میں چھڑ گئی ہے
ملا کو زعم ہے یہ دانم چرا نگویم !
صوفی کو یہ کہ دارم پائے چرا نہ پویم !
ملا یہ کہہ رہے ہیں میرا رسالہ دیکھو
صوفی کا ہے اشارا میرا پیالہ دیکھو
ملا یہ کہہ رہے ہیں قرآن ہی سے بڑھئے
صوفی یہ کہہ رہے ہیں معنی سمجھ کے پڑھئے !
کہتے ہیں کر رہے ہیں ہم یہ رفارمیشن
دیکھا نہیں تھا لیکن مردوں پہ آپریشن !
اس وقت کیا تمہاری یہ خوش خیالیاں ہیں
آپس کی گالیاں ہیں غیروں کی تالیاں ہیں
شیعہ ہوں خواہ سنی ملا ہوں خواہ صوفی
بے سود جنگ باہم ہے سخت بے وقوفی
وقت نزاع باہم ہرگز نہیں ہے یارو
اللہ کو پکارو اللہ کو پکارو (۷) !

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے اس نظم پر حاشیہ لکھا اور تعریف کی

مولانا اکبر نے ۲۷ مئی ۱۹۱۸ء کو انھیں خط میں لکھا "آپ نے ملا و صوفی کی نظم کو خوب زندگی بخشی ۔ اقبال صاحب اس سے خوش نہ ہوئے ۔ خط آیا لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ کس حق سے ملا بنتے ہیں ۔ میں تو صوفی بنتا نہیں شاعری کا کچھ مذاق ہے ۔ اگرچہ بقول آپ کے شاعری اور تصوف اور فلسفہ سب ایک ہے ۔ اقبال صاحب لکھتے ہیں کہ میں "پرسنل خدا کو مانتا ہوں" ۔ جس کے معنی ہوئے شخصی ۔۔۔۔۔۔ پھر ہمہ اوست اور قرآن کے الفاظ کے مقابلے میں "پرسنل گاڈ" پرلے دے کی ہے آخر میں لکھا ہے: "مجھ کو کچھ معلوم نہیں کہ وہ کیا پوزیشن یا درجہ اپنا قائم کرنا چاہتے ہیں" ۔

اوپر کی سطور سے اتنا تو کم از کم واضح ہو گیا ہو گا کہ مولانا اکبر تقلید شرق اور ترک غرب میں غلو سے کام لیتے تھے ۔ تحقیقی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کا تصور مذہب بھی ناقص تھا ۔ ان کے نزدیک مذہب نام تھا قدیم مشرقی روایات اور افکار و خیالات کا اور ان کے تحفظ کو وہ اسلام کی خدمت خیال کرتے تھے ۔ تصور مذہب کی طرح ان کا صوفیانہ نقطہ خیال بھی حقیقت پر مبنی نہ تھا ۔ پچھلے صدہا سال سے اسلامی عقائد اور تصورات اور افکار کے نام سے مختلف مکاتب فکر کے ہاتھوں جو بھی روایات اور آداب و مشاغل ایجاد ہوتے آئے تھے ۔ وہ سب مولانا اکبر کے نزدیک تصوف میں داخل تھے مختلف زمانوں میں جاہ پسند اور کم نظر صوفیوں نے اسلامی تصوف کے ساتھ جو آلائشیں باہر سے لا کر شامل کر دی تھیں انھیں اصل سے الگ کرنے کے لئے ذوق تنقیح و تنقید درکار ہوتا ہے ۔ مولانا اکبر کے پاس بد قسمتی سے اسی ذوق کی کمی تھی ۔ پھر وہ کسی کے سمجھانے پر اپنے نقطہ نظر سے ہٹنے کے لئے تیار بھی نہ تھے ۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ کا ذکر ناظرین کی دلچسپی کا باعث ہو گا ۔

مولانا اکبر کی وفات کے جلد بعد مولوی عبدالماجد صاحب نے ایک مضمون "پیام اکبر" پر چار حصوں میں لکھا تھا جو ۲۳ - ۱۹۲۲ء کے رسالہ اردو میں شائع ہوا تھا - "پانچویں حصے کا عنوان تھا - "تصوف ، معرفت ، فلسفہ پر" کبھی نہ لکھا گیا - بعد ازاں نظر ثانی کے وقت بھی ہمت نہ ہوئی -

اس پانچویں عنوان پر مولوی عبدالماجد صاحب گفتگو کرتے تو ہماری مشکل آسان ہو جاتی - لسان العصر کے صوفیانہ رجحان طبع - ان کی شرقیت پسندی اور مختلف مسالک طریقت سے ان کے گہرے تعلق کے ساتھ اقبال کا ذکر بھی آتا اور اس معاصرانہ چشمک کے مختلف پہلو ہمارے سامنے آجاتے جس کی موجودگی میں اقبال نے مولانا کی جانب سے سخت اور درشت اور غیر صلح پسندانہ کلمات سننے کے باوجود ہمیشہ نیاز مندی کا ثبوت دیا اور آخر دم تک نیاز مندانہ افہام و تفہیم اور صلح جوئی کا رویہ قائم رکھا - اور ادھر مولانا اکبر نے توحد ہی کر دی - "اسرار خودی" کے زیادہ تر وہی حصے پڑھے جن میں خواجہ کا ذکر آیا تھا - مولوی عبدالماجد اس موضوع پر لکھتے تو بے شمار رازوں کا انکشاف کر سکتے تھے - ہمیں کامل یقین ہے کہ مولوی صاحب سے بہتر لسان العصر اکبر پر لکھنے والا آج کوئی دوسرا موجود نہیں ہے - مگر انھوں نے جان بوجھ کر تغافل نہیں برتا - اول تو غالباً عصری مصلحت کا خیال کرکے اس موضوع پر قلم نہیں اٹھایا کیونکہ اقبال ابھی زندہ تھے اور اس واقعہ کے ایک مدت بعد تک زندہ رہے - اور پھر جب رحلت کی تو مسئلہ تصوف کی حقیقت پر اتنے واضح اور صریح نتائج فکر چھوڑ گئے کہ ان کے سامنے مولانا اکبر کے صوفیانہ عقائد کا ذکر بے محل اور رکیک معلوم ہوتا -

یہ تو معاملے کا ایک رخ تھا اب دوسرا رخ دکھانا مقصود ہے - علامہ اقبال کے بعض نہایت اہم خط محفوظ ہیں جو اس نزاع کے زمانے میں اکبر

مرحوم کو لکھے گئے تھے ۔ ان خطوط سے جہاں اقبال کی نیاز مندی اور عقیدت کیشی کی صفات کے ساتھ افہام و تفہیم کے صلح جویانہ رویے کا اظہار ہوتا ہے وہاں مولانا اکبر کے انتہائی پاس و ضعداری اور اپنی سی کہے جانے کا نقص بھی نمایاں ہوتا ہے مولانا نے دوسروں کا نقطہ نظر سمجھنے کی بہت کم زحمت گوارا کی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے عہد کے حال پر ان کی نظر گہری ہو تو ہو لیکن مستقبل میں بہت دور تک وہ نہیں دیکھ سکتے تھے ۔

" اسرار خودی " کی اشاعت کا رد عمل بے حد مایوس کن اور حوصلہ شکن تھا ۔ ہر طرف سے تصوف کے اس تجدیدی نقطہ خیال کو جھٹلایا گیا " خواجہ حسن نظامی صاحب نے اخباروں میں یہ مشہور کر دیا کہ اقبال صوفیائے کرام سے بدظن ہیں ۔ اپنی پوزیشن کو واضح کرنے کے لئے علامہ کو تصوف کی تاریخ پر ایک مفصل مضمون لکھنے کی سخت ضرورت محسوس ہوئی اور انھوں نے اس مضمون کی تیاری میں بڑا وقت اور محنت صرف کی غالباً منصور حلاج کے رسالہ کتاب الطواسین سے بھی مدد لی تھی ۔ صرف اس مضمون کی وجہ سے " رموز بے خودی " کی تصنیف کچھ عرصہ کے لئے رک گئی ۔ ورنہ خیال ہے کہ مثنوی کا یہ دوسرا حصہ جلد تر شائع ہو جاتا ۔

مثنوی کی اشاعت نے علامہ اقبال اور حضرت اکبر کے درمیان اختلاف کی جو خلیج پیدا کر دی تھی اس کو پاٹنے کے لئے علامہ نے بڑے ہی جتن کئے لیکن کوئی محسوس کامیابی نہ ہوئی ۔ ذیل کے اقتباسات سے یہ بات واضح ہو گی

۲۷ ۔ جنوری ۱۹۱۶ء کو لکھا " ان شاء اللہ اختلاف رائے کا اثر پرائیویٹ تعلقات پر نہ ہو گا " ۔ ۴ ۔ فروری ۱۹۱۶ء کے خط میں مثنوی رموز کا یہ شعر جو حضرت عالمگیرؒ کے متعلق ہے درج کیا ہے :

درمیان کار زار کفر و دیں
ترکش ما را خدنگ آخریں

اور مولانا کے قطعہ " حضرت اقبال اور خواجہ حسن " کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے ۔ " خواجہ صاحب کو تو کبھی قبض اور سکر نصیب ہوتا ہو گا ۔ میں اس نعمت سے محروم ہوں " ۔

۱۱ ۔ جون ۱۹۱۸ء کا خط نہایت زور دار ہے ۔ اس میں اقبال نے خواجہ حافظ کے متعلق اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے لکھا ہے " اسرار خودی میں جو کچھ لکھا گیا وہ ایک لٹریری نصب العین کی تنقید تھی جو مسلمانوں میں کئی صدیوں سے پاپولر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اس وقت یہ غیر مفید ہی نہیں بلکہ مضر ہے " پھر فرمایا ہے کہ خواجہ حافظ کی ولایت سے اس تنقید میں کوئی سرد کار نہیں اور نہ ان کی شخصیت سے ۔ اور نہ ان کے اشعار میں " مے " سے ، وہ " مے " مراد لی ہے جو لوگ ہوٹلوں میں پیتے ہیں بلکہ اس سے وہ حالت سکر مراد ہے جو حافظ کے کلام سے بحیثیت مجموعی پیدا ہوتی ہے " پھر کہا ہے کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ نئی بات نہیں ، پہلے بھی حضرت علاؤ الدولہ سمنانیؒ اور جنید بغدادیؒ جیسے بزرگ محی الدین ابن عربی اور منصور حلاج کے متعلق سخت تر الفاظ لکھ گئے ہیں میں نے موخرالذکر بزرگوں سے بیزاری ضرور ظاہر کی ہے " ۔ اگر اسی کا نام مادیت ہے تو قسم بخدائے لایزال مجھ سے بڑھ کر مادہ پرست دنیا میں کوئی نہ ہو گا " ۔

پھر اپنے ایک قیاس کا اظہار کیا ہے " معلوم ہوا ہے کہ آپ نے مثنوی " اسرار خودی " کے وہی اشعار دیکھے ہیں جو خواجہ حافظ کے متعلق لکھے گئے تھے باقی اشعار پر نظر شاید نہیں فرمائی ۔ کاش آپ کو ان کے پڑھنے کی فرصت مل جاتی کہ آپ ایک مسلمان پر بدظنی کرنے سے محفوظ رہتے " ۔

بعدازیں عجمی تصوف کی ظاہری چمک دمک اور اسلامی تصوف کی حقیقی قوت بخشی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ " مسلمانوں کا لٹریچر تمام ممالک اسلامی میں قابل اصلاح ہے یا سیہ لٹریچر کبھی زندہ نہیں رہ سکتا ۔ قوم کی زندگی کے لئے اس کا اور اس کے لٹریچر کا " رجائیہ " ہونا ضروری ہے " ۔ اس کے ساتھ ہی یہ امر مذکور ہے کہ حافظ کے متعلق اشعار کو خارج کرکے ایک عام عنوان یعنی " در حقیقت شعرو اصلاح ادبیات اسلامیہ " اختیار کیا گیا ہے ۔ جس سے یقین ہے کہ بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی اور اصل مطلب بھی واضح ہو جائے گا ۔ خط کے آخری حصہ میں حضرت اکبر کی " گروہ بندی (۸) پر رائے زنی کی ہے اور اس کے نقص کو ظاہر کیا ہے ۔

۲۰ ۔ جولائی ۱۹۱۸ء کا خط اسرار پر مولانا اکبر کے اعتراض تناقض کے رد میں لکھا گیا ہے ۔ یہ بات درست نہیں بلکہ میری بدنصیبی یہ ہے کہ آپ نے مثنوی اسرار خودی کو اب تک نہیں پڑھا ۔ ۔ ۔ ۔ ایک مسلمان پر بدظنی کرنے سے محترز رہنے کے لئے میری خاطر سے ایک دفعہ پڑھ لیجئے ۔ اگر آپ ایسا کرتے تو یہ اعتراض نہ ہوتا :

آں چناں گم شو کہ یکسر سجدہ شو

اس کے بعد اسرار کے بعض دوسرے اشعار درج کئے ہیں مثلاً :

اندکے اندر سرائے دل نشیں
ترک خود کن سوئے حق ہجرت گزیں

پھر " بخودی " کی دو قسمیں بتائی ہیں ۔ پورا خط قابل مطالعہ ہے ۔ آخر میں دوبارہ استدعا کی ہے ۔ " زیادہ کیا عرض کروں سوائے اس کے کہ مجھ پر عنایت کیا رحم فرمائیے ، اور " اسرار خودی " کو ایک دفعہ پڑھ جائیے ۔ جس طرح منصور کو شبلی کے پتھر (کذا) سے زخم آیا اور اس کی تکلیف سے اس نے

آہ و فریاد کی اسی طرح مجھ کو آپ کا اعتراض تکلیف دیتا ہے "۔

۲۵ جولائی ۱۹۱۸ء کے خط میں مولانا اکبر کے مصرع " غم بڑا مدرک حقائق ہے " کی تعریف کی ہے ۔ اور جہاں ہستی ہوئی محدود ۔ ۔ ۔ ۔ والے شعر کا ہم معنی شعر مولانا رومی کی مثنوی سے نقل کیا ہے :

ہر خیالے را خیالے می خورد
فکر ہم بر فکر دیگر می چرد

۱۳ ۔ اگست ۱۹۱۸ء کے خط میں خاص چیز " باپ کی نگاہ شفقت " کا ذکر ہے ۔

۱۴ ۔ ستمبر ۱۹۱۸ء کے خط میں ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کے اس موافق تبصرے کا ذکر کیا موصوف نے دونوں مثنویوں پر زبان ۲۸ ۔ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو جو مکتوب لکھا ۔ اس میں مولانا اکبر کے مطلع کم ہیں جو سمجھتے ہیں کہ مقصود وہی ہے پر داد دی ۔

اسی زمانے میں اسلامیہ کالج (لاہور) کے فلسفہ کے پروفیسر ڈاکٹر ہیگ چیچک میں مبتلا ہو کر دفعتہً انتقال کر گئے ۔ ارباب کالج کی درخواست پر علامہ ایم ۔ اے فلسفہ کی جماعت کو تاریخ فلسفہ پڑھانے لگے ۔ یہ شغل کچھ دن جاری رہا ۔ انہی دنوں اکبر مرحوم کو خط لکھا تو اس میں اس واقعے کا ذکر کیا اور کہا کہ تاریخ فلسفہ " انسان کی ذہنی مایوسیوں اور ناکامیوں کا افسانہ ہے پھر لکھا : " بہرحال ان لیکچروں کے بہانے سے ان لڑکوں کے کان میں کوئی نہ کوئی مذہبی نکتہ ڈالنے کا موقع مل جاتا ہے " علامہ اپنی کلاس کو مولانا اکبر کا یہ شعر بھی سنایا کرتے تھے :

میں طاقت ذہن غیر محدود جانتا تھا خبر نہیں تھی
کہ ہوش مجھ کو ملا ہے تل کر نظر بھی مجھ کو ملی ہے نپ کر

انسانی علم کے قلیل اور ناکافی ہونے کی اس سے اچھی وضاحت کہاں ملے گی ۔

علامہ کو اکبر مرحوم کی یہ رباعی بے حد پسند تھی:

ہنگامہ شکر و شکوہ دنیا میں ہے گرم
لیکن مرے دل سے یہ صدا آتی ہے
کھلتا نہیں راز دہر شکوہ ہے تو یہ
اور شکر یہ ہے کہ موت آجاتی ہے

مولانا اکبر مرحوم کو ذیل کا شعر بہت پسند تھا:

دو سہ گام اگر پئے دل برہش دویدہ باشی
ز چہا گزشتہ باشی بچہا رسیدہ باشی

کسی شخص کو انھوں نے دوسرا مصرع یوں پڑھتے سنا:

زجہاں گزشتہ باشی بہماں رسیدہ باشی

تو اقبال کی رائے دریافت کی علامہ نے ۔ ۲۰ ۔ اپریل ۱۹۱۹ء کے خط میں دوسری صورت کے متعلق لکھا کہ جو شخص اس طرح پڑھتا ہے " وہ زبان اور شعر دونوں کے ذوق سے معرا ہے " اسی خط میں : ایں سر خلیل است بآذر نتواں گفت پر دوسرا مصرع لگانے کے لئے کہا ہے:

اب ہمارے سامنے وہ تعزیتی خط ہے جو علامہ اقبال نے مولانا اکبر کی وفات کی خبر سن کر ان کے صاحبزادے سید عشرت حسین مرحوم کو تحریر کیا تھا دوسرے خطوط کی طرح یہ خط بھی مولانا اکبر کی ذات سے اقبال کے گہرے تعلق خاطر کو ظاہر کرتا ہے ۔ اپنے کسی بزرگ سے عقیدت ہو تو ایسی ہو ۔ ذیل میں اسی خط کا کچھ حصہ نقل کیا جاتا ہے ۔ " ابھی زمیندار (اخبار) سے آپ کے والد بزرگوار (اور میرے مرشد معنوی) کے انتقال پر ملال کی خبر ہوئی ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون اس بات کا ہمیشہ قلق رہے گا کہ ان سے آخری

ملاقات نہ ہو سکی وہیں اور میرے ایک دوست قصد کر رہے تھے کہ ذرا گرمی کم ہو جائے تو ان کی زیارت کے لئے الہ آباد کا سفر کریں ۔ انھوں نے اپنے آخری خط میں مجھے لکھا تھا ۔ امسال ضرور ملنا ۔ بعض باتیں ایسی ہیں کہ خطوط میں نہیں سما سکتیں میری بدنصیبی ہے کہ میں ان کے آخری دیدار سے محروم رہا ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں میں مرحوم کی شخصیت تقریباً ہر حیثیت سے بے نظیر تھی ۔ اسلامی ادیبوں میں تو شاید آج تک ایسی نکتہ رس ہستی پیدا نہیں ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ تمام ایشیا میں کسی قوم کے ادبیات کو اکبر نصیب نہیں ہوا ۔ فطرت ایسی ہستیاں پیدا کرنے میں بخیل ہے ۔ زمانہ سیکڑوں سال گردش کھاتا رہتا ہے ۔ جب اسے ایک اکبر ہاتھ آتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔

(۱۲ ستمبر ۱۹۲۱ء)

مولانا اکبر اور علامہ اقبال کی یہ آخری ملاقات واقع ہوتی تو بڑے امید افزا نتائج پیدا ہونے کی توقع تھی ۔

ہم نے ان خطوط کا نہایت ہی مختصر جائزہ لیا ہے ۔ صاحب ذوق حضرات کو چاہیئے کہ پورے خطوط خود ملاحظہ فرمائیں ان کے مطالعہ سے اتنا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ حضرت لسان العصر " نواہائے اقبال " کی تاب نہ لا سکے اور موخر الذکر کا رہوار فکر ان کے لئے ذرا گریز پا واقع ہوا ۔

اس میں شک نہیں کہ حیات اکبر کے آخری دو ڈھائی برس قدرے سکون اور خاموشی میں گزرے غیظ و غضب کے وہ سوز ناک شعلے جو ستمبر ۱۹۱۵ء میں یک لخت بھڑک اٹھے تھے اب کافی مدھم پڑ گئے تھے لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ مولانا اکبر آخر عمر میں اپنے نقطہ خیال سے ہٹ کر اقبال کے ہم نوا بن گئے ۔ ایسا کبھی نہیں ہوا ۔ یہ دراصل رد عمل تھا اس احساس شکست کا

جو اقبال کی فعال شخصیت اور اس کی حوصلہ بخش انقلابی شاعری نے اکبر کے اندر پیدا کر دیا تھا ۔ سرسید مرحوم کی وفات پر مولانا اکبر نے جن مصلحت آمیز جذبات کا اظہار کیا تھا وہ بھی حقیقت میں اسی احساس کا نتیجہ تھے ۔

یہاں ان دو عظیم شاعروں کی باہم اثر اندازی و اثر پذیری پر چند اشارات مفید ہوں گے ستمبر ۱۹۱۵ء سے پہلے مولانا اکبر اقبال کو اپنا جانشین نامزد کر چکے تھے اور ان کی اور ان کے اشعار کی مدح میں بعض دوستوں اور عزیزوں کے خطوط میں اپنے اشعار بھی لکھتے رہے تھے مثلاً کلیات حصہ دوم میں اقبال کی کسی نظم کی تعریف میں یہ دو شعر ملتے ہیں :

اس نظم کا نقطہ ہے منبع نور
ہر حرف سے ہے تجلی حق کا ظہور
اوج ملکوت کا ہے عالم ہر لفظ
ہر بیت اقبال کی ہے بیت المعمور

مگر اتنا یقینی ہے کہ اکبر مرحوم نے اقبال کے طرز سے اثر کوئی نہیں لیا اس کی سب سے بڑی وجہ ان کی وضع داری تھی ۔

اقبال کی شاعری اس زمانے میں ابھی جوان ہو رہی تھی ، اور وہ اپنے عظیم الشان فلسفہ حیات کی طرح ڈالنے کے لئے دل و دماغ کی قوتوں کو مجتمع کر رہے تھے ۔ بالآخر ستمبر ۱۹۱۵ء میں اس کا بنیادی پتھر رکھا گیا ۔ اب اسے بدقسمتی سمجھئے یا اتفاق کہ یہ بوجھل پتھر حضرت اکبر کی مشرقیت پسندی اور روایات پرستی کی بنیادیں کھود کر نصب کیا گیا اکبر سخت برہم ہوئے اس کے بعد مدح و توصیف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ اس حادثے سے اقبال کو تکلیف ضرور ہوئی لیکن وہ جواں مرد انسان تھے اور مولانا رومی کے شعر:

ہر خیالے را خیالے می خورد

فکر ہم بر فکر دیگر می چرد

پر ایمان رکھتے تھے ۔ اس لئے باہم تعلقات کو قطعاً متاثر نہ ہونے دیا ، اور آخر دم تک لسان العصر کے مرید بنے رہے ، اور ان کے طرز سے متاثر ہو کر ان کے رنگ میں ظریفانہ لکھتے رہے ۔ انہیں اشعار کو بعد ازاں خواجہ حسن نظامی نے " اکبری اقبال " کا نام دیا " اکبری اقبال " بانگ درا کے " ظریفانہ " ہی کا دوسرا نام ہے اس کے متعلق اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ اس میں اقبال اپنا کوئی طرز نکالنے میں کامیاب ہوئے ہوں تو ہوئے ہوں ، اکبر کا رنگ پیدا کرنے میں زیادہ کامیاب نہیں ہوئے ۔ لیکن یہ مخلصانہ " شاعرانہ داد " اور پھر ۱۸ ۔ اگست ۱۹۱۸ء کے نیوایرا میں اکبر کی شاعری پر موافق مضمون لکھنا اس امر کے کافی ثبوت ہیں کہ اقبال نے حضرت لسان العصر کے ساتھ اپنے مریدانہ تعلقات میں کوئی فرق نہ آنے دیا تھا ۔ اس پر مستزاد یہ کہ مولانا کے آخری دنوں تک ان کی خدمت میں اکتساب فیض کی خاطر حاضر بھی ہوتے رہے ۔ اور جب انھوں نے جان جان آفریں کے سپرد کی تو اقبال نے ذیل کے سدا بہار پھول ان کی تربت پر نچھاور کیئے :

دریغا کہ رخت سفر بست اکبر
حیاتش بحق بود روشن دلیلے
سر ذروہ طور معنی کلیمے
بہ بت خانہ دور حاضر خلیلے
گہے گریہ او چو ابر بہارے
گہے خندہ او چو تیغ اصیلے
نوائے سحرگاہ او کارواں را
اذانے درائے پیامے رحیلے

ز دلہا ربائندہ لات و عزائے
بجانہا کشائندہ سلسبیلے
دماغش ادب خوردہ عشق و مستی
دلش پرورش دادہ جبرئیلے !

اس سے زیادہ کوئی مرید اپنے پیر کے حق میں کیا کہے گا۔

فٹ نوٹ:

(۱) ۔ یہ سب اشعار مولوی قمر الدین صاحب بدایونی کی " ڈائری سے نقل کئے ہیں ۔

(۲) ۔ بزم اکبر صفحہ ۸۱

(۳) ۔

اور بھی دور فلک ہیں ابھی آنے والے
ناز اتنا نہ کریں ہم کو مٹانے والے

(۴) ۔ " اسرار خودی " والے مضمون کا ضروری حصہ نقل کرنا پڑا ہے ۔ اس کے بغیر چارہ نہ تھا ۔

(۵) ۔ صفحہ ۱۳۵ ۔

(۶) ۔ صفحہ ۱۴۱ :

(۷) ۔ مقالات ماجد صفحہ ۱۱۷ ۔ ۱۸ الحمراء : یہ غالباً دفتر " ستارہ صبح " لاہور تھا ۔

(۸) ۔ " مذہب کیا ہے گروہ بندی ہے فقط "

اقبال اور پرندے

شیخ فرید الدین عطارؒ نے " منطق الطیر " لکھی تو دنیائے ادب میں ایک یگانہ کارنامہ انجام دیا ۔ اس سے پہلے بہت کم شاعروں نے پرندوں کو اپنے احساسات و خیالات کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا ہو گا ۔ ذاتی محسوسات و جذبات کے اظہار کے لئے پرندوں کے منہ میں زبان ڈال دینا ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے ، لیکن شاعر لوگ اکثر ایسے ہی نرالے طریقوں سے اپنے بیان کو مؤثر اور دلکش بنا لیتے ہیں ۔ بہت سے شاعروں نے ہد ہد ، کبوتر ، قمری اور بلبل سے اپنے دل کی بات کہلوائی ہے اور اس طرز ادا سے کہلوائی ہے کہ سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا ۔ خود خدائے پاک اپنی صفات کے اظہار کے لئے بعض دفعہ پرندوں کی چہک اور فغاں مستعار لے لیتا ہے :

گاہے بہ برگ لالہ نویسد پیام خویش
گاہے درون سینۂ مرغاں بہ ہا و ہوست

انگلستان کے شاعروں میں شیلے کی نظم " ODE TO A SKY LARK اور کیٹس کی نظم " ODE TO A NIGHTINGALE " اپنی مثال آپ ہیں ورڈ زورتھ بھی شیلے کی طرح " SKYLRRK " کا دل دادہ تھا ان شاعروں نے اپنے محبوب پرندوں کے دل کی دھڑکن کو محسوس کیا ہے اور اپنے خون کی گرمی سے ان کے ننھے دلوں کو گرمایا ہے اور ان کے نازک پروں کو فلک پیمائی کی جرات عطا کی ہے ۔ بعض دوسرے شاعروں نے پرندوں کے محض اوصاف گنانا کافی سمجھا ہے اس ضمن میں ٹینی سن کی نظم " THE EAGLE" اور بینسن (BENSON) کی نظم " THE HAWK " پیش کی

جا سکتی ہیں ۔

ہمارے اردو اور فارسی شعراء نے زیادہ تر بلبل ، طوطی ، کبک ، قمری اور پروانے کا ذکر کیا ہے ، لیکن اس خیال سے نہیں کہ ان کی خصوصیات اور خوبیاں گنائی جائیں بلکہ اکثر و بیشتر ان کی عاشق مزاجی کا چرچا کیا ہے اور ان کی حالت زار پر ماتم کیا ہے ۔ اس کی بڑی وجہ شاید یہ ہے کہ ہمارے شعراء زندگی کا تاریک رخ دیکھنے کے عادی چلے آئے ہیں اور روشن پہلو پر نظر اٹھانے سے غالباً ان کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں ۔ اس کی دوسری توجیہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ ہمارے تنانوے فی صدی شعراء کے ہاں پیغام کافقدان ہے ۔ لہذا انہوں نے کسی مخصوص پیام کی روشنی میں مظاہر فطرت پر کبھی غور نہیں کیا

اقبال ایک پیغام بر شاعر تھے ان کی شاعری بامقصد شاعری تھی انہوں نے اکثر دوسرے شاعروں کی طرح یا وہ گوئی نہیں کی ، بلکہ کم و بیش اپنی ہر آواز اور ہر لفظ کو ایک بلند زندگی بخش مقصد کے حصول میں صرف کیا ہے ۔ ان کی زندگی اور شاعری کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ اصل اسلامی قدروں کو جنھیں ہمارے زمانے کے لوگ یکسر بھول چکے ہیں از سر نو زندہ کیا جائے تاکہ دنیا میں ایک بار پھر اسی صحت مند روحانیت کا دور دورہ ہو جائے جس کا مشاہدہ دنیا کی آنکھ اسلامی قرن اول میں کر چکی ہے اقبالؒ اسی حکمت کے گم شدہ لعل کی بازیابی کے لئے ساری عمر کوشاں رہے اور اس کوشش میں انہوں نے دیگر موثر اسالیب بیان کے ساتھ ساتھ قدرتی مظاہر اور طیور و وحوش سے بھی اپنے اظہار مطلب میں مدد لی یہی وجہ ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی مخلوق سے لے کر بڑی سے بڑی مخلوق تک میں جہاں بھی انہیں کوئی مفید مطلب اشارہ ملا اسے انہوں نے اس کی اصل صورت میں صرف ذرا چمکا کر اپنے شعر میں جگہ

دے دی ۔ مثلاً ایک طرف انہوں نے پہنائے آسمان میں ستاروں کی خواری و زبونی کا ذکر کرکے عام انسانی توہم کو جو ان کے حصول مقصد میں حارج تھا، ٹھکرا دیا تو دوسری طرف پرندوں کے چہچہوں اور نغموں سے کام لے کر اپنے شعر میں قدرتی شیرینی اور نغمگی کو سمیٹ لیا ہے جس تعداد میں اقبال نے پرندوں کا ذکر اپنے کلام میں کیا ہے، شاید کسی دوسرے شاعر نے نہیں کیا ۔ ان پرندوں کے انتخاب میں انہوں نے مندرجہ اصول کے ماتحت مقصدیت کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا پھر ساتھ ہی ساتھ یہ التزام بھی کیا ہے کہ پرندوں کی منفرد اور جداگانہ خصوصیات کو برقرار رکھا جائے تاکہ بیان غیر واقعاتی نہ بننے پائے ۔

اقبال کے ہاں پرندے اپنی جدا حیثیت رکھتے ہیں ہر پرندہ الگ خصوصیات کا مظہر اور نمائندہ نظر آتا ہے ۔ مورد مگس اور پشہ و پروانہ (ہم ان کو بھی پرندوں ہی میں شمار کریں گے) سے لے کر کرگس و شاہین تک ان کی نگہ انتخاب سے اوجھل نہیں رہے حقیر سے حقیر پرندوں سے لے کر عظیم پرندوں تک کی انفرادیت اور جداگانہ حیثیت سے انہوں نے کام لیا ہے اور اپنے کلام کو ان کے چہچہوں اور نغموں سے دلکش اور جاذب توجہ بنانے کی کوشش بھی کی ہے شاہین تو شاہین انہوں نے بال جبریل اور پر اسرافیل تک کو نظر انداز نہیں کیا اور بعض دفعہ اس مقام سے بھی آگے بڑھ کر خود حضرت انسان کو ذوق پرواز سے آشنا کیا ہے مرئی انجم شناس کا قول ہے:

پیکر گل آں اسیر چند و چون
از مقام تحت و فوق آمد برون
خاک را پرواز بے طیارہ داد
ثابتاں را جوہر سیارہ داد

ہم اپنا بیان حقیر اور چھوٹے پرندوں کے ذکر سے شروع کریں گے اور

پھر بتدریج اہمیت کے اعتبار سے دوسرے پرندوں پر اقبال کے خیالات کا اظہار کریں گے۔

لپشہ و مورو مگس: اقبال نے مور و مگس تک کو ان کے ذکر سے نوازا ہے۔ مچھر تک ان کی نظر سے اوجھل نہیں رہا فقر کے معجزات کا ذکر کرتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ فقر "لپشہ" تک کو شہباز کے اوصاف عطا کر دیتا ہے:

بے پراں را ذوق پروازے دہد
لپشہ را تمکین شہبازے دہد

عشق کو پر شہباز اور ہوس کو پر مگس سے تشبیہ دیتے ہیں:

عشق طینت میں فرومایہ نہیں مثل ہوس
پر شہباز سے ممکن نہیں پرواز مگس

سیاسی پیشواؤں کی فریب کاریوں کو کمند عنکبوت سے تشبیہ دی ہے:

ہمیشہ مورو مگس پر نگاہ ہے ان کی
جہاں میں ہے صفت عنکبوت ان کی کمند

زنبور عسل: شہد کی مکھی کے کام سے اقبال نے ایک نہایت دلچسپ تشبیہ پیدا کی ہے ملوکیت کا کام ان کی نظر میں بالکل زنبور عسل کے مماثل ہے:

ہم ملوکیت بدن را فربہی است
سینہ بے نور او از دل تہی است
مثل زنبورے کہ بر گل می چرد
برگ را بگزارد و شہدش برد
شاخ و برگ و رنگ و بوے و گل ہماں
بر جمالش نالہ بلبل ہماں

مرگ باطن گرچہ دیدن مشکل است
گل مخواں او را کہ در معنی گل است

پروانہ : پروانے کے متعلق شیخ سعدی نے کہا تھا :

آں سوختہ راجاں شد و آواز نیامد

لیکن اقبال ایسے پروانے کو پسند نہیں کرتے جو شمع کے ایک ہی جلوے کے عوض اپنی جان سستے داموں بیچ ڈالے وہ تو سخت کوش اور شعلہ نوش قسم کے پروانوں کو پسند کرتے ہیں :

بہل افسانہ آں پا چراغے
حدیث سوز او آزار گوش است
من آں پروانہ را پروانہ دانم
کہ جانش سخت کوش و شعلہ نوش است

کرمک شب تاب : جگنو کو اقبال بہت عزیز رکھتے ہیں وہ خود دار ہے کیونکہ پروانے کی طرح آتش کی دریوزہ گری نہیں کرتا :

دریوزہ گر آتش بیگانہ نہیں میں

اگر بڑے پرندوں میں اقبال کو شاہین سے محبت ہے تو حقیر پر داروں میں وہ جگنو سے انس رکھتے ہیں جگنو کہتا ہے :

اگر شب تیرہ تر از چشم آہوست
خود افروزم چراغ راہ خویشم

بانگ درا کی نظم " جگنو " نہایت لطیف اور دلچسپ نظم ہے پیام مشرق میں انہوں نے " کرمک شب تاب " پر ایک نہایت ہی پر معنی اور خیال انگیز

نظم لکھی ہے جو غالباً پوری دنیائے ادب میں بے مثال قرار دی جا سکتی ہے ۔ جگنو کو وہ پروانے ہی کی ترقی یافتہ صورت خیال کرتے ہیں:

یک ذرہ بے مایہ متاح نفس اندوخت
شوق ایں قدرش سوخت کہ پروانگی آموخت
پہنائے شب افروخت

پروانہ بے تاب کہ ہر سو تگ و پو کرد
بر شمع چناں سوخت کہ خود را ہمہ او کرد
ترک من و تو کرد

پوری نظم پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہے ایک مصرع ہے:

ماہے کہ برومنت خورشید حرام است

ایک مقام پر شاعر کو کرم شب تاب سے تشبیہ دی ہے کتنے معرکے کا استعارہ ہے:

کرم شب تاب است شاعر در شبستان وجود
در پر و بالش فروغے گاہ ہست و گاہ نیست

کبک و کبوتر کنجشک و حمام: نہایت حقیر اور بے بس پرندے ہیں ان کا کام صرف یہ ہے کہ طاقتور جانوروں کا شکار ہو جائیں اور دم نہ مار سکیں ۔ بھنے ہوئے تیتر پر ابوالعلا معری کا نوحہ دیکھنے کے قابل ہے کبک کی چال اور اس کی چاند سے محبت مشہور ہیں اقبال کا خیال ہے کہ کبک کو خود اپنی کوشش اور سعی سے اتنی متوازن چال نصیب ہوئی ہے:

کبک پا از شوخی رفتار یافت

الو: الو اور شپرک رات کے پرندے ہیں دن کو یہ عموماً کھنڈروں یا خرابوں کی

تاریکی میں پناہ لے لیتے ہیں ۔ الو کے متعلق علامہ کا ایک نہایت دلچسپ شعر ہے:

معلوم نہیں ہے یہ خوشامد کہ حقیقت
کہہ دے کوئی الو کو اگر رات کا شہباز

بلبل و دراج و سار: اقبال کا نظریہ رقص و سرود عام تصور سے بہت مختلف ہے ان کے ہاں سرود اگر روح کو بالیدگی بخشتا ہے تو حلال ہے ورنہ حرام:

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب

صوفیا سماع کو اسی سبب سے جائز قرار دیتے تھے کہ اس سے روح کی نشو و نما ہوتی ہے:

وہ شعر کہ پیغام حیات ابدی ہے
یا نغمہ جبریل ہے یا بانگ سرافیل

غلاموں کے فن موسیقی سے اقبال کو سخت نفرت ہے وہ سمجھتے ہیں کہ:

بیوہ زن را ایں چنیں شیون رواست

اسی وجہ سے ہندی موسیقی کو روح کے لئے زہر ہلاہل خیال کرتے ہیں ان کی تحقیق یہ ہے:

مطرب ما جلوہ معنی ندید
دل بصورت بست و از معنی رمید

اور ان کا فتوے یہ ہے:

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا

بانگ ہزار اور نوائے سار کو وہ قدرتی نغمہ خیال کرتے ہیں انہوں نے دوسرے شاعروں کی طرح صدائے بلبل کو آہ و شیون سے تعبیر نہیں کیا، بلکہ ان کے خیال کے مطابق بلبل کا نغمہ تن میں روح اور روح میں آرزو پیدا کرتا ہے ساقی نامہ میں ہے:

چہ شیریں نوائے چہ دلکش صدائے
کہ می آید از خلوت شاخسارے
بہ تن جاں بہ جاں آرزو زندہ گردد
ز آوائے سارے ز بانگ ہزارے

نغمہ بلبل میں انہیں بلا کی (۱) تاثیر نظر آتی ہے وہ یقین رکھتے ہیں کہ اگر بلبل پورے سوز و گداز کے ساتھ نغمہ پیرا ہو تو کبوتروں میں بھی روح عقابی پیدا ہو سکتی ہے جبھی فرماتے ہیں۔

نواپیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

بلبل ہی کی نوائے مستانہ کا اثر ہے کہ:

دراج کی پرواز میں ہے شوکت شاہیں
حیرت میں ہے صیاد یہ شاہیں ہے کہ دراج

سحر خیزی کے کرشمے دیکھئے:

شاہیں کی ادا ہوتی ہے بلبل میں نمودار
کس درجہ بدل جاتے ہیں مرغان سحر خیز

بلبل کی متعلق نظریہ ارتقا میں اقبال یقین رکھتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ:

بلبل از سعی نوا مستقار یافت

بلبل کی آنکھ کے آنسو کو ایک مقام پر قطرہ شبنم سے تشبیہ دی ہے شعر بے حد

دلچسپ بن گیا ہے:

قطرہ شبنم سر شاخ گلے
تافت مثل اشک چشم بلبلے

زاغ و کرگس: زاغ اور کرگس اقبال کی نظر میں حقیر اور ذلیل پرندے ہیں۔ کرگس کی بلند پروازی انہیں پسند ہے لیکن اس کی مردار خوری اور طبعی رذالت انہیں بہت گراں گزرتی ہے۔ کرگس بھی اگر شاہین کی طرح جسور و غیور بن جائے تو اس میں اور شاہین میں تمیز کرنا مشکل ہو جائے:

پھرا فضاؤں میں کرگس اگرچہ شاہیں وار
شکار زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا

اور

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
شاہیں کا جہاں اور ہے کرگس کا جہاں اور

۱۹۳۵ء میں ابی سینیا کی زہر ناک لاش پر جھپٹنے والے مغربی جنگ بازوں کو اقبال یورپ کے کرگس کہہ کر پکارتے ہیں زاغ "مرغ سرا" ہے اور گھر کی بچی کھچی چیزوں پر گزارہ کرتا ہے، اگر اور کچھ نہ ملے تو مردوں کی ہڈیوں ہی کو نوچ کر پیٹ بھر لیتا ہے: ع

رزق زاغ و کرگس اندر خاک گور،

زاغ نہایت ذلیل پرندہ ہے اگر کسی پرندے سے بوجوہ صفات بہتر ہے تو اس شاہین سے جو کسی بادشاہ کا دست آموز بن چکا ہے:

زمن گیر ایں کہ زاغ دخمہ بہتر

ازاں بازے کہ دست آموز شاہیست

شاہین : بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اقبال نے شاہین کا تصور بھی فوق الانسان کے تصور کی طرح نیٹشے سے لیا ہے یہ دوسرا سوال اقبال کی زندگی ہی میں اٹھایا گیا تھا اور اس کے اولین ذمہ دار مسٹر ڈکنسن اور بعض دوسرے یوروپین مصنف تھے علامہ نے ڈاکٹر نکلسن کے نام اپنے ایک خط میں اس اعتراض کا معقول اور مبنی پر حقائق جواب دے دیا تھا شاہین کے تصور کی خوشہ چینی کا سوال بعد میں اٹھایا گیا ہے یہ سوال بھی پہلے سوال کی طرح غلط فہمی پر مبنی ہے اس کا زور دار اور معقول جواب دینا اب اقبال کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرنے والوں کے ذمہ ہے ۔

اس بات کا ہمیں اعتراف ہے کہ اقبال کا شاہین بھی نیٹشے کے عقاب کی طرح قوت اور شوکت کا مظہر ہے ، لیکن دراصل دونوں شاہینوں میں طینت اور مزاج کا فرق ہے قوت اور شوکت کا وجود اپنی جگہ بالکل درست ہے مگر قوت اور شوکت کا اظہار اور استعمال ہر جگہ درست نہیں ہے ایک طرف سرتاپا ظلم ہی ظلم اور استبداد ہی استبداد ہے ۔ دوسری طرف قہاری اور جبروت کے ساتھ تقدیس بھی لازم ہے یہ موضوع ایک علیحدہ مضمون اور توجہ کا طالب ہے خیال ہے کہ فی الحال یہی اشارات کافی ہوں گے ۔

شاہین ، جرہ باز ، جرہ شاہین ، عقاب اور شہباز اقبال کے ہاں ہم معنی الفاظ ہیں اقبال کے ذکر شاہین نے شاہین کو اتنا بلند نام دیا ہے کہ اپنی بلند بامی کی بدولت وہ اتنا بلند نہیں تھا علامہ کو یہ پرندہ بے حد محبوب تھا ۔ انہوں نے مولوی ظفر احمد صدیقی کے نام ایک خط میں شاہین کی وہ تمام خصوصیات گنائی ہیں جن کی وجہ سے ان کی نظر انتخاب شاہین پر پڑی ۔ یہاں خط کا ضروری حصہ نقل کر دینا فائدہ سے خالی نہیں ہو گا لکھتے ہیں :

" شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں اس جانور میں اسلامی فقر کے تمام خصوصیات پائے جاتے ہیں ۔ (۱) خود دار اور غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا (۲) ۔ بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا (۳) بلند پرواز ہے ۔ (۴) ۔ خلوت پسند ہے ۔ (۵) ۔ تیز نگاہ ہے " ۔

ذیل میں شاہین کی انہی خصوصیات کی وضاحت اشعار سے کی جائے گی

(۱) ۔ خود دار اور غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا ۔

اقبال خودی کے پیغمبر تھے ان کی نظر میں خودی ہی " راز درون حیات ہے " کائنات میں جہاں کہیں زندگی کے آثار نظر آتے ہیں سبھی خودی کے معجزہ سے ظہور پذیر ہوئے ہیں خودی کی حفاظت اور نگہداری کرنا ، خود داری کہلاتا ہے شاہین میں علامہ نے خود داری کی صفت بدرجہ اتم موجود پائی شاہین اپنی خوراک کے لئے خود پرندوں کو شکار کرتا ہے وہ ایک قطرہ خون کو لعل ناب سے بہتر سمجھتا ہے اس کی نصیحت شاہین بچوں کو ہمیشہ یہ ہوتی ہے :

نگہ دار خود را و خورسند زی
دلیر و درشت و تنومند زی
تن نرم و نازک بہ تیہو گزار
رگ سخت چوں شاخ آہو بیار
نصیب جہاں آنچہ از خرمی است
ز سنگینی و محنت و پردمی ست
ز دست کسے طعمہ خود مگیر
نکو باش و پند نکویاں پذیر

ہر دفعہ عقاب نخچیر کا خون پینے کے لئے اس پر نہیں جھپٹتا بلکہ مقصد یہ ہوتا

ہے کہ " محنت و پردمی " سے اپنا خون گرم رکھ سکے :

جھپٹنا ، پلٹنا ، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ !

اسے کبوتر کے خون میں وہ مزہ نصیب نہیں ہوتا جو اس پر جھپٹنے سے میسر آتا ہے :

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں !

شاہین جسور و غیور ہے اس کا دل نخچیر کے لئے نہیں پسیجتا کیونکہ اگر پسیجنے لگے تو شاہین شاہین نہیں رہ سکتا :

دلِ شاہین نسوزد بہر آں مرغے کہ در چنگ است

شاہین اگر کبھی زمینی شکار سے محروم رہ جائے تو اپنی بلند نگاہی اور بلند بالی کے بل بوتے پر ماہ و پروین پر منقار تیز کر لیتا ہے :

رزق بازاں در سواد ماہ و ہور

اپنی نئی پود کو اس نے ہمیشہ یوں جرات کی تعلیم دی ہے :

بہ پرواز آ کہ صید مہر و ما ہے می تواں کردن

۲ - بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا :

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ شاہین آشیانہ بنا کر درختوں میں نہیں رہتا ۔ اس کی منزل ہمیشہ سے پہاڑوں کی بلند درشت اور ٹیلی چٹانیں رہی ہیں چٹانوں میں بسیرا کرنے سے ایک تو اس کے پنجے سخت گیر بن جاتے ہیں اور دوسرے اس کی منقار تیز رہتی ہے :

کہ برسنگ رفتن کند تیز چنگ

اور وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ جب چاہے چیتے کی آنکھ نوچ لے :

برد مردمک راز چشم پلنگ

وہ اپنی چونچ کو مٹی سے صاف کرنا باعث ننگ خیال کرتا ہے اور پرندوں کی اس جماعت کو حقیر خیال کرتا ہے جو اپنی چونچ خاک سے پاک کرتے ہیں :

چہ قومے فرومایہ و ترسناک
کند پاک منقار خود را بخاک

شاہین باغ و راغ میں اس لئے بسیرا نہیں کرتا کہ وہاں حقیر پرندوں کی صحبت اسے خراب کر ڈالے گی اور اس کے ذاتی جوہر ضائع ہو جائیں گے :

تو اے شاہیں نشیمن در چمن کر دی ازاں ترسم
ہوائے او ببال تو دہد پرواز کوتاہے

کیا پتے کی بات کہی ہے :

خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم
ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ

اور

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبت زاغ

محراب گل افغان کو اپنے کہستان بہت عزیز ہیں ۔ لاکھ بے آب و گیاہ سہی مگر حفظ بدن کے لئے نہایت موزوں ہیں اپنے کہستان سے خطاب کیا ہے :

روز ازل سے ہے تو منزل شاہین و چرخ
لالہ و گل سے تہی نالہ بلبل سے پاک
باز نہ ہوگا کبھی بندہ کبک و حمام

حفظ بدن کے لئے روح کو کردوں ہلاک

زاغ کی نظر میں شاہین کے بال و پر بھدے ہیں اور چمگادڑ اسے اندھا خیال کرتی ہے لیکن شاہین کے ہاں یہ حقیر پرندے پرندوں کی قوم کے اچھوت ہیں:

زاغ کہتا ہے نہایت بدنما ہیں تیرے پر
شپرک کہتی ہے تجھ کو کور چشم و بے ہنر
لیکن اے شہباز یہ مرغان صحرا کے اچھوت
ہیں فضائے نیلگوں کے پیچ و خم سے بے خبر
ان کو کیا معلوم اس طائر کے احوال و مقام
روح ہے جس کی دم پرواز سر تا پا نظر!

(۳) - بلند پرواز ہے شاہین کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ نہایت بلند بال ہے - زمین والوں سے بہت کم سرو کار رکھتا ہے اس کی نگاہ ہمیشہ ستاروں پر رہتی ہے وہ کہتا ہے:

ز روئے زمیں دانہ چیدن خطاست
کہ پہنائے گردوں خدا داد ماست

اور

فضائے نیلگوں مخیر گاہش
نمی گردد بگرد آشیانہا

اس کا یہ فخر کیا کم ہے:

صحراست کہ دریاست نہ بال و پر ماست

اقبال کا خیال ہے کہ جب خالق عالم نے مٹھی بھر پروں میں شاہین کی روح پھونکی تو روز ازل ہی سے اس سے کہہ دیا تھا کہ تو آسمان گرد ہے زمین

کی پستی سے دور رہے گا ۔ حضرت علامہ کو شاہین کی یہ خصوصیت بے حد پسند آئی وہ انسان کو بھی " جذب خاک " سے آزاد کرانے کی فکر میں رہتے تھے ۔ " جذب خاک " سے آزاد ہو جانا ان کے نزدیک بہت بڑی سعادت ہے :

پرزن واز جذب خاک آزاد شو

(۴) ۔ خلوت پسند ہے ۔ شاہین کی خلوت پسندی سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اس کی زندگی راہبانہ ہے ۔ قطعاً نہیں رہبانیت اپنے مروجہ معنوں میں دراصل ایک یکسر غیر فطری طرز عمل ہے ۔ شاہین کی زندگی حقیقت میں مجاہدانہ ہے وہ اپنے پہاڑی نشیمن میں غلط قسم کے توکل کرکے نہیں بیٹھ رہتا بلکہ ہر دم اور ہر لحظہ نظر کشائی ، پرواز اور زور آزمائی میں مصروف رہتا ہے کیونکہ :

مرگ بود باز را زیستن اندر کنام

خلوت پسندی سے یہ مراد ہے کہ وہ پست فطرت اور دون ہمت جانوروں سے کوئی تعلق نہیں رکھتا یہی کم آمیزی اس کی قوت و شوکت اور وقار کا باعث ہے ۔

(۵) ۔ تیز نگاہ ہے ۔ شاہین کی تیز نگاہی بھی ایک قابل ستایش خوبی ہے بلند بال ہونے کے ساتھ تیز نگاہی کی خوبی ضروری ہے پہنائے گردوں میں اپنے ماحول اور فضا کے پیچ و خم سے بے خبر رہنا کسی طرح نگاہ میں نہیں جچتا چیتے کی آنکھ اگر رات کے وقت جنگل میں چراغ کا کام دیتی ہے تو دن میں چشم عقاب شعاع آفتاب سے کسی طرح کم نہیں ہے :

شاہین کی خوبیاں دراصل بندہ مومن کی خوبیاں ہیں اقبال نے مومن کو ہمیشہ شاہین سے تشبیہ دی ہے اور مسلمان کو شاہین کی طرح بلند نگاہ جسور و غیور سنگین و محکم خود دار اور درویش صفت بن جانے کی تلقین کی ہے مثنوی

"پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" میں لکھتے ہیں:

مومناں را گفت آں سلطان دیں
مسجد من ایں ہمہ روئے زمیں
الاماں از گردش نہ آسماں
مسجد مومن بدست دیگراں
صید مومن ایں جہان آب و گل
باز را گوئی کہ صید خود بہل ؟
حل نشد ایں معنی مشکل مرا
شاہیں از افلاک بگریزد چرا
وائے آں شاہیں کہ شاہینی نکرد
مرغکے از چنگ او نامد بدرد
در کنامے ماند زار و سرنگوں
پر نزد اندر فضائے نیلگوں
ایں چمن دارد لبے شاخ بلند
بر نگوں شاخ آشیان خود مبند
نغمہ داری در گلو اے بے خبر
جنس خود بشناس با زاغاں مپر !

اقبال کی نظم میں خود بندہ مومن عظیم ترین پرندہ ہے:

پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتا ہے

معمولی طاقت پرواز نہیں بلکہ چاہے تو "بال و پر روح الامین" پیدا کر سکتا ہے لیکن دیکھئے ذوق پرواز میں خود روح الامین پر فوقیت رکھتا ہے وہ مقام جہاں جبریل کے بھی پر جلتے ہیں اور وہ یہ کہہ کر ٹھٹک جاتے ہیں کہ:

اگر یک سر موئے برتر پرم
فروغ تجلی بسوزد پرم

مومن عشق کے پر مارتا بے محابا گزر جاتا ہے اور عین "حضور حق" میں جاحاضر ہوتا ہے ۔ مومن نہایت عظیم پرندہ ہے:

پ چڑھتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں
جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن

اور کبھی جبریل و سرافیل بھی اس کی نظر میں نہیں جچتے اور وہ اپنے اندر خود حضرت یزداں پر کمند پھینکنے کا عزم اور حوصلہ پاتا ہے:

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ !

بعض اوقات شعرا اپنے آپ کو پرندوں سے تشبیہ دیتے ہیں ۔ فیضی نے اکبر سے اپنی رہائی کا مطالبہ اس بالواسطہ طریق سے کیا تھا:

زانکہ من طوطی شکرخایم
جائی طوطی درون پنجرہ بہ

دوسرے شاعر اپنے آپ کو بلبل ہزار داستان طوطی خوش الحان وغیرہ سے تشبیہ دیا کرتے ہیں اقبال کبھی تو اپنے آپ کو "طائر حرم" کہہ کر پکارتے ہیں اور کبھی شاہین کا لقب اپنے لئے پسند کرتے ہیں ۔ مثلاً اس شعر میں:

فقیران حرم کے ہاتھ اقبال آ گیا کیوں کر
میسر میر و سلطاں کو نہیں شاہین کافوری

اور

اسی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا برسوں

بڑی مشکل کے بعد آخر یہ شاہیں زیر دام آیا

اور کبھی شاہین سے بھی بلند کوئی لقب اپنے لئے تلاش کرتے نظر آتے ہیں:

بلند بال چنانم کہ بر سپہر بریں
ہزار بار مرا نوریاں کمیں کردند

اقبال خود غرض اور خود نگر نہیں تھے ان کی ہمیشہ یہ تمنا رہی کہ مسلمان بچے شاہین و عقاب کے خصائص اور اطوار سیکھیں ۔ انہیں خدا وندان مکتب سے شکایت تھی ، کیونکہ ان کے خیال میں وہ :

سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاک بازی کا

اور

خشت را معمار ما کج می نہد
خوئے بط با بچہ شاہیں دہد

ان کی عمر بھر رب ذوالجلال سے یہی دعا رہی:

بجلال تو کہ در دل دگر آرزو ندارم
بجز ایں دعا کہ بخشی بکبوتراں عقابی

آخر عمر میں جب انہوں نے محسوس کیا کہ دعا قبول ہونے میں ابھی دیر ہے تو انھوں نے ہمت کرکے خدا کا کام خود اپنے ذمہ لے لیا اور قوم کے نوجوان طبقے کو مخاطب کرکے کہا:

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشت پرے داری
بیا من با تو آموزم طریق شاہ بازی را

فٹ نوٹ:

(۱) ۔ "الحرا": ان اشعار میں بلبل سے مراد خود شاعر ہے اور کبوتر اور دراج سے مراد قوم کے وہ افراد ہیں جو پہلے غلامی کی زندگی پر قانع تھے ۔

اقبال اور سلیمان ندوی

مکاتیب اقبال حصہ اول کی اشاعت ہوئی تو بعض اقبال پسند حلقوں میں اس کا رد عمل نہایت افسوس ناک ہوا ۔ لوگوں نے عقیدت اقبال کے زعم میں روح اقبال پر ظلم کر ڈالا ۔ اس سے بڑی ستم ظریفی اور کیا ہو گی کہ اقبال ساری عمر جس پست قسم کی ذہنیت اور گری ہوئی اخلاقی حالت کو سدھارنے کی کوشش کرتے رہے ۔ ان کے آنکھ بند کرتے ہی اسی ذہنیت کا استعمال انہی کا نام لے کر ہوا اور خوب بے دھڑک ہوا ۔ خبر نہیں اقبال بدقسمت تھے یا یہ لوگ جو بہ لحاظ زمان و مکان ان کے قریب رہ کر بھی کورے اور بے نصیب نکلے ۔ لوگ دور دور سے آکر پیاس بجھا جاتے تھے اور یہ دن رات ساحل بحر پر بیٹھنے والے پانی کے ایک دو گھونٹ بھی حلق سے نیچے نہ اتار سکے ۔

اس اندھی اور گمراہ کن عقیدت کو ٹھیس لگانے میں مرتب اقبال نامہ نے بڑا کام کیا ۔ انھوں نے بعض بزرگوں کے نام اقبال کے وہ خطوط بھی شائع کر دیئے جن سے یہ ظاہر تھا کہ اقبال اپنی ہمہ دانی کے باوجود بعض زندہ ہندی و پاکستانی صاحبان علم سے استفادہ بھی کرتے رہے تھے یہ حقیقت ان لوگوں کے نزدیک قطعاً ناقابل برداشت تھی بھلا یہ کہاں ممکن تھا کہ اقبال یورپ سے فارغ التحصیل ہو کر آئین اور ان کا ذہن ابھی اتنا ناپختہ ہو کہ اسے پختگی کے لئے مشرق سے مدد کی ضرورت پیش آئے حالانکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اقبال کی صورت میں، مشرق نے جو کارنامہ انجام دیا تنہا مغرب اسے تا ابد انجام نہ دے سکتا یہ خیال درست ہے کہ مغرب نے اقبال کے ذوق مطالعہ کو

جلا دی ان کی نظر کو وسعت بخشی انھیں زندگی کے حقائق کا راز دان بنایا اور ان کی دیگر خفتہ قوتوں کو بیدار کیا لیکن ان قوتوں کو ایک اعلیٰ اور قابل جدوجہد مقصد کے حصول میں صرف کرنے کا سبق اقبال نے مشرق ہی سے لیا یہیں وہ میدان عمل تھا جہاں ان کے افکار اپنی مکمل اور پختہ صورت میں ڈھل کر ظاہر ہوئے اور بے شمار انسانوں کے ذہنی انقلاب کا موجب بنے یہ بھی ممکن تھا کہ اقبال راہ فرار اختیار کرکے مغرب میں جا بستے لیکن وہاں بھی مشرق سے پھوٹنے والے نور کے بغیر وہ اپنے گھر کو روشن نہیں کر سکتے تھے۔

اقبال نے ہمیں کیا دیا ؟ یہ سوال جتنا اہم ہے اتنا مشکل بھی ہے۔ مشکل اس لئے کہ مختلف ذہنوں میں اس کے مختلف جواب پیدا ہوں گے اور اس لئے بھی کہ ان مختلف جوابوں میں سے اصل جواب ڈھونڈ لینا آسان نہیں میرے نزدیک اس سوال کا اصل جواب یہ ہے کہ اقبال نے زندگی بسر کرنے کے ان محکم اصولوں کی طرف ہماری راہ نمائی کی جنھیں ہم مدت سے فراموش کر چکے تھے اقبال نے زندگی میں ان اصولوں کو اختیار کرنے کی منطق ہمارے ذہن نشین کی اقبال نے زندگی کے متعلق دیگر مسالک فکر کے مقابلے میں ان اصولوں کی برتری ثابت کی اقبال ان اصولوں کی روح میں اتر گئے اور جو کچھ انہوں نے خود محسوس کیا وہ ہمیں بھی محسوس کرانے کی کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب ہوئے یہی ان کی شاعری کا کمال ہے۔

زندگی کے یہ اصول جن کی طرف اقبال نے اپنی تحریروں میں اشارہ کیا ہے منضبط اور منظم صورت میں ان کے ہاں مطالعہ کرنے والے کو نہیں ملتے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوں جوں ان کے مختلف پہلو ان کی گرفت میں آتے گئے اور وہ عملی اعتبار سے ان کی قدر و قیمت اور ہمہ گیری سے متاثر ہوتے گئے پوری دیانت داری کے ساتھ وہ انہیں شعر کا دلچسپ لباس پہنا کر لوگوں کے

سامنے پیش کرتے رہے ۔ اس سے زیادہ کی ان سے توقع کرنا عبث ہے ، اس لئے کہ ایک تو وہ شاعر تھے جو اشاروں اور کنایوں کی زبان میں باتیں کرتا ہے اور دوسرے ان کی زندگی کا اصل حصہ مغربی فلسفہ کے مطالعہ میں بسر ہوا تھا جو اپنے مزاج اور ماہیت کے اعتبار سے ان اصولوں کے خلاف واقع ہوا ہے ۔ اسلامی نظام حیات میں ان کے لئے کیوں کر کشش پیدا ہو گئی ؟ اس کا اصل موجب کچھ اقبالؒ کی ذاتی نیک بینی خلوص اور محنت اور کچھ اللہ کی دین سمجھنا چاہیئے ۔ یہ خیال کہ اسلامی حکمت کا شعور اقبال کو ورثے میں ملا محض ایک غلط سی بات ہے ۔

اقبال یورپ سے لوٹے تو اسلامی اصول حیات کو سمجھنے کی لگن ساتھ لائے بظاہر یہ جملہ آپ کو عجیب معلوم ہو گا آپ سوچیں گے ۔ اس میں تناقض ہے دراصل اسی تناقض کو حل کرنے کی خاطر میں نے اقبال کی ذاتی صفت نیک بینی اور اللہ کی دین کا ذکر کیا ہے ۔ اقبال یورپ کو سدھارے تو تکمیل فلسفہ کی دھن لے کر گئے اور واپس آئے تو اسلامی فلسفہ حیات کے مطالعے کی دھن لے کر آئے یہ ایک حقیقت ہے ۔ اقبال کا مطالعہ کرتے وقت یہ حقیقت بہر حال ہمارے ذہن میں رہنی چاہیئے ۔

وطن لوٹ کر اقبال نے بہت کچھ سیکھا اور یہ سب کچھ مشرق سے سیکھا مغرب کو ایک حد تک انھوں نے بھلانا شروع کر دیا تھا اور اپنے آخری دنوں میں وہ غالباً اسے بالکل بھلا چکے تھے ۔ ان کا نقطہ نظر یکسر بدل چکا تھا اور وہ اپنی تعلیمات اور افکار کے اعتبار سے مشرقی بن چکے تھے ۔

اقبال کے مطالعہ مذہب کو نکھارنے میں اب کیمبرج کے پروفیسر جیمز وارڈ اور میکٹیگرٹ اور ہائیڈل برگ کے کاملان فن کے بجائے بعض ہم وطن بزرگوں نے حصہ لینا شروع کیا میری ذاتی رائے یہ ہے کہ جیسے اقبال اپنی طبعی

جودت اور ذہنی استعداد کے کرشمے دکھا کر اپنے مغربی استادوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا کرتے تھے (اور ان میں سے اکثر نے ان کی اعلیٰ قابلیت کا اعتراف بھی کیا) ویسے ہی ان ہندی و پاکستانی بزرگوں سے بھی بالآخر بیشتر مذہبی مسائل اور ان کی حکمت کے شعور میں وہ سبقت لے گئے اور ان کی آنکھ نے جن مقامات اور سربستہ رازوں کا مشاہدہ کیا، ان کی لذت کچھ وہی جانتے تھے۔

ہندو پاکستان میں اقبال نے جن بزرگوں سے فیض حاصل کیا، یہاں ان میں سے صرف ایک کا ذکر مقصود ہے اس ذکر سے بعض عقیدت کیش چراغ پا نہ ہوں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یورپ میں اقبال جیمز وارڈ اور میکٹیگرٹ ہی سے فلسفہ نہیں سیکھتے تھے بلکہ جرمنی کے دوران قیام میں انھوں نے بعض زاہد فریب اور نوخیز دختران ہائڈل برگ کے سامنے بیٹھ کر بھی وسعت نظر کا سبق لیا ان میں سے کبھی کسی حسینہ نے اقبال کو رو برو بٹھا کر ان کی تحصیل فلسفہ کا امتحان لینا شروع کیا اور غلطیوں پر انہیں ٹوکا تو انھوں نے نادم ہو کر بچوں کی طرح اپنا ہاتھ دانتوں میں کاٹ کاٹ لیا (۱)۔

یہ بزرگ جن کا ذکر آگے آتا ہے علمی لحاظ سے اتنے بلند ہیں کہ انھیں بے تکلف یورپی علماء کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے اور جہاں تک ہمارے اپنے علوم کا تعلق ہے، یہ بزرگ یورپی علماء کو ابھی بہت کچھ سکھا سکتے ہیں۔ اقبال نے بھی ان سے وہی کچھ سیکھا جو وہ یورپی علماء سے نہیں سیکھ سکتے تھے

مکاتیب سے پتا چلتا ہے کہ سید سلیمان ندوی صاحب سے علامہ مرحوم کے تعلقات مدت العمر نہایت مخلصانہ اور گہرے رہے ہیں۔ سید صاحب اقبال کے لئے مولانا شبلی مرحوم کے بعد "استاذ الکل" تھے مکاتیب میں انہی کے نام خطوط کی تعداد سب سے زیادہ ہے آپ یہ خطوط پڑھتے جائیے اور اقبال کے

بیسیوں قسم کے استفساروں کا جائزہ لیتے جائیے آپ کے تصور میں معاً ایک ذہین اور محنتی طالب علم کا نقش ابھرے گا جو ایک قابل اعتماد اور ہمہ دان استاد سے اپنی روز مرہ کی مشکلیں آسان کرا رہا ہے اور اپنے کام میں مشورے طلب کر رہا ہے اور کبھی کبھی ایک مستعد اور طباع شاگرد کی طرح استاد کو بہت کچھ سمجھا بھی دیتا ہے ۔

آغاز کے دو چار خطوط کو چھوڑ کر ۱۹۱۹ء کے اواخر تک بیشتر خطوط میں فارسی زبان کے محاورے پر گفتگو ملتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " اسرار " اور " رموز " اشاعت کے بعد سید صاحب کی نظر سے گزری تھیں اور انہوں نے از راہ اصلاح بعض محاورے کی لغزشوں سے علامہ کو آگاہ کیا تھا اقبال نے بعض باتوں سے اتفاق کیا اور بعض کو اساتذہ فارسی کے حوالے سے قبول نہ کیا یہ خطوط فارسی زباندانی کے تحقیقی مطالعے کی ایک نہایت دلچسپ مثال پیش کرتے ہیں ان خطوط سے مسئلہ زبان کے متعلق اقبال کے نقطہ خیال کی بھی وضاحت ہوتی ہے مثلاً یہ کہ اولیت کا درجہ وہ زبان کو نہیں بلکہ خیالات کو دیتے تھے زبان کو انھوں نے کبھی بت تصور نہیں کیا بلکہ ہمیشہ انسانی خیالات و افکار کے اظہار کا ذریعہ سمجھا جو ادب کا اصل جوہر ہوتے ہیں ۔

بعد کے خطوط میں جن اہم مسائل کے متعلق علامہ نے استفسار کیا ہے ۔ انھیں ذیل میں سلسلہ وار درج کیا جاتا ہے :

(۱) ۔ کیا صوفی حکمائے اسلام میں سے کسی نے زمان و مکان و حرکت کی حقیقت پر بحث کی ہے ؟

(۲) ۔ متکلمین میں سے بعض نے علم مناظر و مرایا کی رُو سے خدا تعالیٰ کی رویت ممکن ثابت کی ہے ، یہ بحث کہاں ملے گی ؟

(۳) ۔ مرزا غالب کے اس شعر کا مفہوم آپ کے نزدیک کیا ہے ۔

ہر کجا ہنگامہ عالم بود
رحمتہ للعالمینے ہم بود

(ب) شیخ الاشراق متاخ کی ایک شکل یعنی " محمدیت کے لئے متاخ یا بروز " کے قائل تھے ۔ ان کے اس عقیدے کی وجہ یہی تو نہ تھی ؟ (یعنی شعر غالب) ۔

(۴) ۔ (ا) حضرت محی الدین ابن عربی کی بحث زمان کا ملخص اگر عطا ہو جائے تو بہت عنایت ہو گی ۔ (ب) مسئلہ زمان کے متعلق امام رازی کے خیالات کا خلاصہ ۔ (ج) ۔ متکلمین کے نقطہ خیال سے حقیقت زمان یا آن سیال پر مختصر اور مدلل بحث درکار ہے کون سی کتاب میں ملے گی ۔ ۔ ؟

(د) ۔ ہندوستان میں برے بڑے اشاعرہ کون کون سے ہیں ؟

(۵) ۔ حضرت اویس قرنی اور ان سے منسوب صوفی روایات کے متعلق آپ کا خیال اور امام مالکؒ کی تحقیق کیا ہے ؟

(۶) ۔ کیا روسی مسلمانوں میں بھی ابن تیمیہؒ اور محمد ابن عبدالوہابؒ نجدی کے حالات کی اشاعت ہوئی تھی ؟ مفتی عالم جان کی تحریک کی اصل غایت تعلیمی انقلاب تھا یا مذہبی ؟

(۷) ۔ کیا مسلمانوں کے فقہی لٹریچر میں کوئی ایسا حوالہ موجود ہے کہ اجماع امت نص قرآنی کو منسوخ کر سکتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اجماع سے نص کی تخصیص یا تعمیم کی مثال سے آگاہ فرمائیے کیا ایسی تخصیص یا تعمیم صرف اجماع صحابہ ہی کر سکتا ہے یا علماء و مجتہدین امت بھی کر سکتے ہیں ؟ ۔ ۔ ۔ (ب) کیا کوئی ایسا حکم بھی ہے جو صحابہ نے نص قرآن کے خلاف نافذ کیا ہو ، اور وہ کون سا حکم ہے ؟ ۔ (ج) اگر کوئی ایسا حکم ہے تو ناسخ حکم سوائے حدیث نبوی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا ۔ گویا حدیث ناسخ قرآن ہو سکتی ہے جس سے کم از کم مجھے تو انکار

ہے آپ کی رائے کیا ہے ؟

(۸) ۔ رسول اکرمؐ نے کسی مسئلے کا جواب وحی کی بنا پر دیا تو وہ تمام امت پر حجت ہے ، لیکن جو جواب محض استدلال کی بنا پر دیا جس میں وحی کو دخل نہیں کیا وہ بھی تمام امت پر حجت ہے ؟

(۹) ۔ کیا آیہ توریث میں حصص بھی ازلی ابدی ہیں یا قاعدہ توریث میں جو اصول مضمر ہے ، صرف وہی ناقابل تبدیل ہے اور حصص میں حالات کے مطابق تبدیلی ہو سکتی ہے ۔ آیہ وصیت کی جزئیات سے بھی آگاہ فرمائیے ۔

(۱۰) ۔ کیا امام کو اختیار ہے کہ قرآن کی کسی مقرر کردہ حد کو ترک کر دے اور اس کی جگہ کوئی اور حد مقرر کر دے اور اس اختیار کی بنا کون سی آیت قرآنی ہے ؟ ۔ ۔ ۔ (ب) احکام منصوصہ میں توسیع اختیارات امام کے اصول کیا ہیں ؟ ۔ ۔ ۔ (ج) اگر امام توسیع کر سکتا ہے تو ان کے عمل کو محدود بھی کر سکتا ہے کسی تاریخی مثال سے واضح فرمایئے ۔

(۱۱) ۔ نبی کریمؐ کی دو حیثیتیں ہیں نبوت اور امامت ۔ اجتہاد کی بنا محض عقل بشری اور تجربہ و مشاہدہ ہے یا یہ بھی وحی میں داخل ہے دلیل سے واضح فرمایے ؟

(۱۲) وحی غیر متلو کی تعریف نفسیاتی اعتبار سے کیا ہے ؟

(۱۳) ۔ بخاری کی حدیث لاتسبوا الدہر ۔ ۔ کا مذہب حکمائے اسلام میں سے کس نے اختیار کیا ہے یہ بحث کہاں ملے گی ؟ ۔ ۔ ۔ (ب) اگر دہر ممتد اور مستمر ہے اور حقیقت میں اللہ تعالے ہی ہے تو پھر مکان کیا چیز ہے ۔ ۔ ۔ ۔ یا یوں کہیے کہ زمان و مکان دونوں کی حقیقت اصلیہ دہری ہے کیا یہ خیال ابن عربی کے نقطہ خیال سے صحیح ہے ؟

(۱۴) ۔ تواتر عمل کی ایک مثال " نماز " ہے لیکن مالکیوں اور حنفیوں اور

شیعوں میں جو اختلاف صورت نماز میں ہے وہ کیونکر ہوا ؟

(۱۵) ۔ (ا) ۔ زمین کا مالک قرآن کے نزدیک کون ہے اسلامی فقہا کا مذہب اس بارے میں کیا ہے ؟ ۔ ۔ ۔ (ب) اگر کوئی اسلامی ملک (روس کی طرح) زمین کو حکومت کی ملکیت قرار دے تو کیا یہ بات شرع اسلامی کے موافق ہو گی یا مخالف ؟

(۱۶) ۔ (ا) لفظ " نار " کا روٹ عربی زبان میں کیا ہے ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ (ب) لفظ " نجات " کا روٹ کیا ہے اور روٹ کی رو سے اس کے معنی کیا ہیں ؟

(۱۷) ۔ کیا فقہ اسلامی کی رو سے توہین رسولؐ قابل تعزیر جرم ہے ۔ اگر ہے تو اس کی تعزیر کیا ہے ؟

(۱۸) ۔ کیا علمائے اسلام میں کوئی ایسے بزرگ بھی گزرے ہیں جو حیات و نزول مسیح ابن مریم کے منکر ہوں یا اگر حیات کے قائل ہوں تو نزول کے منکر ہوں ؟ معتزلہ کا عام طور پر اس مسئلے میں کیا مذہب ہے ؟

(۱۹) ۔ لفظ " بروز " کے متعلق اگر کوئی نکتہ آپ کے ذہن میں ہو یا کہیں صوفیہ کی کتابوں میں اس پر بحث ہو تو اس کا پتا دیجیئے ؟

یہ سوالات میں نے جستہ جستہ نقل کیئے ہیں اور کوشش کی ہے کہ ہر قسم کے سوالات درج ہوں اقبال کا مذاق فلسفیانہ تھا اس لئے بیشتر سوالات کا مزاج فلسفیانہ ہے آپ دیکھتے ہیں معمولی اور ابتدائی باتوں سے لے کر اسلامی فلسفے کے مہمات امور تک سبھی پر انہوں نے غور و فکر کیا ہے اور انھیں ایک نظام کے اجزاء کے طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے ۔

مکاتیب میں بیسیوں اصحاب کے نام خطوط جمع ہیں ہر مار عقیدت مندوں کے خطوط کی ہے جو اقبال سے ان کے اشعار کے معنی اور ان کی تصانیف کے متعلق دیگر تفاصیل پوچھتے ہیں بعض سیاسی ، مذہبی ادبی اور تعلیمی

مسائل کی حکمت اور تفصیل دریافت کرتے ہیں اپنی کتابوں ، نظموں اور اشعار پر ان کی رائے طلب کرتے ہیں یہ خطوط بھی اپنی جگہ بڑے اہم ہیں ، البتہ وہ (خطوط جو مولانا صدریار جنگ مرحوم ، حافظ محمد اسلم جیراج پوری مولانا عبدالماجد دریا بادی ، مولانا اکبر الہ بادی مرحوم ، مولانا عبدالحق صاحب ، مولانا مسعود عالم ندوی ، پیر مہر علی شاہ گولڑوی مرحوم ، حضرت قائداعظمؒ ، مہاراجہ کشن پرشاد آنجہانی ، عطیہ بیگم صاحبہ وغیرہ کے نام لکھے گئے ۔ الگ نوعیت کے اور زیادہ دلچسپ پر معنی اور قابل مطالعہ ہیں لیکن سید سلیمان صاحب کے نام خطوط کی ایک نرالی شان ہے یہاں ایک علمی لگن اور ایک جستجو ہے جو مکتوب نگار کی رگ رگ میں خون کی طرح چہکتی ، بولتی نظر آتی ہے اور اس کی علمی تشنہ کامی کے عجیب منظر آنکھوں کو دکھاتی ہے یہ خطوط اس مخصوص تعلق خاطر کو ظاہر کرتے ہیں جو اقبال کو جناب سید صاحب کی ذات اور اعلیٰ اسلامی اور علمی مسائل سے تھا یہ تعلق پورے مکاتیب میں کسی اور کے ساتھ نظر نہیں آتا پوچھنے والے نے کہیں مبتدی کی حیثیت سے سوال کئے ہیں اور کہیں منتہی کے لباس میں کہیں سوال کرنے سے پہلے متعلقہ موضوع پر اپنا نقطہ نظر بھی پیش کر دیا ہے اور کہیں مکتوب الیہ کی رائے کا لحاظ کرتے ہوئے اپنا خیال ظاہر نہیں کیا کہیں سوالات کے جواب سے پورا پورا اتفاق کیا ہے اور کہیں جزوی اتفاق اور کہیں یکسر اختلاف لیکن بات منوانے کے لئے اپنی ہمہ دانی یا علمی افتخار کا سہارا نہیں لیا بلکہ اسناد اور حوالہ جات سے قائل کرنا چاہا ہے کہیں کسی مسئلے کے سمجھنے میں الجھن ہوئی ہے ۔ اور رشتہ معنی ہاتھ نہیں آیا تو عذر خواہی کے ساتھ دوسری بار بلکہ تیسری بار پوچھنے میں عار محسوس نہیں کی کہیں ایک مسئلے کی تحقیق میں صرف رائے یا قیاس پر اتفاق نہیں کر لیا بلکہ اسناد اور ان کا محل و مقام طلب کیا ہے کہیں اسناد کی ثقاہت پر بحث کی ہے اور

بعض کو قابل قبول اور بعض کو قابل رد ٹھہرایا ہے لیکن ان سب صورتوں میں خطوط کا نیاز مندانہ اور احترام آمیز انداز برقرار رکھا ہے اور الفاظ کے انتخاب میں متانت اور وقار کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔

مکاتیب میں نکاح و طلاق ہدیہ موکلین موضوعات حدیث کی اقسام متعہ صدقات کی قسمیں ختم نبوت وغیرہ مسائل کے علاوہ اقبالؒ نے زمان و مکان عقاید معتزلہ اشاعرہ اور اسلامی امام کے اختیارات فی الارض کے مختلف پہلوؤں کے متعلق بار بار استفسار کیا ہے مسئلہ زمان و مکان کو وہ مسلمانوں کے لئے زندگی و موت کا مسئلہ خیال کرتے تھے اور انھیں یقین تھا کہ قدیم مسلمان صوفیہ و حکمائے کے تصورات اور نظریات زمان و مکان کا مطالعہ کیا جائے تو انھیں جدید طبیعی اضافی نظریہ زمان و مکان کے ہم پایہ اور ہم رتبہ ثابت کیا جا سکتا ہے۔ عقاید مذہب کی جان ہوتے ہیں۔ معتزلہ اور اشاعرہ کے افکار کی تاریخ اور عقاید پر ان کے عقلی دلائل کا جائزہ وہ اس غرض سے لینا چاہتے تھے کہ خطبات کی تصنیف کے سلسلے میں اسلامی عقاید کی زمانہ حال کے افکار کے مطابق توجیہ کرنے میں مدد مل سکے۔ اصول امامت کا مسئلہ غالباً اسلامی نظام حیات کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ لہذا اقبال نے اس کے مختلف پہلوؤں پر توجہ کی اور اسے سمجھنے کی کوشش کی پھر بعض مسائل ایسے بھی تھے جن کے متعلق محض خط و کتابت سے ان کی تشفی نہیں ہو سکتی تھی، اس لئے انہوں نے بعض خطوط میں سید صاحب سے استدعا کی کہ وقت نکال کر ان پر مستقل رسالے اور کتابیں تصنیف کریں یہ مسائل مختصراً یہ ہیں۔

(۱) ۔ فقہ اسلامی کی تاریخ لکھیئے۔ آپ کے سوا یہ کام کون کرے گا۔

(۲) ۔ یاجوج ماجوج پر کوئی مضمون لکھیئے۔ یہ امر تحقیق کا محتاج ہے۔

(۳) ۔ حکمائے اسلام پر ایک کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔

(۴) ۔ ہندوستانی مسلمانوں نے جن بڑے بڑے مسائل پر غور و فکر کیا ہے ، ان کی تاریخ لکھیئے اور اس کام کو اپنی زندگی کے اہم مقاصد میں شمار کیجئے ایک خط میں سید صاحب سے اپنی عقیدت کا اظہاریوں کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ " علوم اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے " ۔

سید صاحب سے ان علمی موضوعات پر کتابیں لکھنے کی فرمائشوں کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اقبال سید صاحب موصوف کو مولانا شبلی کا صحیح جانشین خیال کرتے تھے ، جنھوں نے ایسے ہی موضوعات پر خامہ فرسائی میں عمر بسر کی تھی اور دوسرا سبب یہ کہ سید صاحب کے لئے ان مآخذ تک رسائی آسان تھی جن کے بغیر یہ کتابیں لکھی ہی نہ جا سکتی تھیں ۔

حیرت ہوتی ہے کہ ایک ایسی زندگی جو مغربی فلسفے کا زہر ناک رس چوس کر پلی بڑھی تھی بالآخر ایک زندگی بخش اور انقلاب پرور مقصد میں صرف ہوئی اس قلب ماہیت میں جیسا کہ ذکر ہوا اقبال کی ذاتی صفت نیک بینی اور خلوص بنیادی طور پر اہم تھے پھر مطالعہ قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ بعض اسلاف مثلاً رومی و سنائی کے اثر کے علاوہ چند معاصر ہندی و پاکستانی علماء کا دخل بھی سمجھنا چاہیے جن میں مولانا شروانی مرحوم ، مولوی عبدالماجد ، مولوی مسعود عالم ندوی ، اور پیر مہر علی شاہ گولڑوی مرحوم کا نام لیا جا سکتا ہے ، لیکن اس عہد کی تاریخ لکھنے والا اقبال اور مقامی علماء کے علمی تعلقات کا تذکرہ لکھتے وقت اقبال اور سید سلیمان ندوی کے نام یقیناً قریب قریب لکھے گا ۔

نٹ نوٹ:

۱۔ بحوالہ عطیہ بیگم صاحبہ